دو ناولٹ

ٹوٹا ہوا آدمی

اور

مقدس جیل

خالد سہیل

rekhta

ناولٹ

ٹوٹا ہوا آدمی

خالد سہیل

خالد سہیل

28 DEC 1990

TOOTA HUA ADMI NOVELET

DR. KHALID SOHAIL

(CANADA)

دو ناولٹ	ٹوٹا ہوا آدمی اور مقدس جھیل
مصنّف	ڈاکٹر خالد سہیل
قیمت	۸۰/- روپے دس ڈالر
طابع	کلاسیکل پرنٹرس۔ چاوڑی بازار۔ دہلی
کور ڈیزائن	مشہور فن کار صادق
ملنے کے پتے	نصرت پبلشرز۔ حیدری مارکیٹ۔ لکھنؤ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۳۱۰۸ گلی عزیز الدین وکیل،
کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶

اردو انٹرنیشنل
[illegible] بلور اسٹریٹ ویسٹ۔ ٹورنٹو، انٹیریو۔ کینیڈا M6H 1N9

PUBLISHER
CREATIVE LINKS
PUBLISHING & AUD/VIDEO FILM PRODUCTION
PENT HOUSE NO-6 100 WHITE OAKS CRT WHITBY
ONTARIO CANADA LIP IB7
TEL. 416-666-2140

کچھ مصنف کے بارے میں

نام — خالد سہیل

پیدائش — جولائی ۱۹۵۲ء پاکستان

رہائش — کینیڈا ۱۹۷۷ء

تعلیم — ایم بی بی ایس (پاکستان)
ایف آر سی پی (کینیڈا)

پیشہ — ماہرِ نفسیات

مصنف کی دوسری تصنیفات

۱۔ تلاش (شاعری) ۱۹۸۵ء

۲۔ زندگی میں خلا (افسانے) ۱۹۸۵ء

۳۔ بریکنگ دی چینز (افسانوں کا انگریزی ترجمہ) ۱۹۸۶ء

۴۔ اِک پَیر وِچ زنجیر (افسانوں کا پنجابی ترجمہ) ۱۹۸۶ء

۵۔ سوغات (بین الاقوامی کہانیوں کا اردو ترجمہ) ۱۹۸۶ء

۶۔ بھگوان ایمان انسان (فلسفیانہ مضامین کا اردو ترجمہ) ۱۹۸۷ء

۷۔ مغربی عورت، ادب اور زندگی
(مغربی خواتین ادیبوں کے
افسانوں اور مضامین کا اردو ترجمہ) ۱۹۸۷ء

۸۔ چنگاریاں (افسانوں کا کیسٹ) ۱۹۸۸ء

۹۔ تازہ ہوا کا جھونکا (شاعری کا کیسٹ) ۱۹۸۸ء

۱۰۔ ایک کلچر سے دوسرے کلچر تک (مقالے کا کیسٹ) ۱۹۸۹ء

rekhta

ان ہمسفروں

کے

نام

جو راستوں میں کہیں کھو گئے

خالد سہیل

لخت لخت

پیش لفظ — ڈاکٹر شارب ردولوی — ۱۱

پگڈنڈی سے شاہراہ تک — ۱۷

ٹوٹا ہوا آدمی (ناولٹ)

۱۔ کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی — ۲۵

۲۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی — ۴۷

۳۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے — ۶۹

۴۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا — ۸۵

۵۔ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا — ۹۳

۶۔ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا — ۹۹

۷۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے — ۱۰۹

۸۔ زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب — ۱۱۷

۹۔ جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے — ۱۲۱

۱۰۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ۱۳۱
۱۱۔ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا ۱۳۶
۱۲۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ۱۴۵
۱۳۔ دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۱۶۳
مقدس جیل (ناولٹ) ۱۶۹

پیش لفظ

ڈاکٹر شارب ردولوی

علم، تجربہ اور حالات انسان کو بالوں کے سفید ہونے سے پہلے بوڑھا بنا دیتے ہیں اور اس کی معصومیت چھین لیتے ہیں۔ خالد سہیل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ لوگ جو ذاتی طور پر ان سے واقف نہیں ہیں اگر ان کی کتابیں پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ وہ کوئی سن رسیدہ مصنف، تجربہ کار افسانہ نگار اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اس کا بنیادی سبب ان کا علم اور تجربہ ہے جس نے انھیں زندگی اور اس کے مسائل پر اتنی گہرائی سے غور کرنے کا سلیقہ اور شعور دیا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کی عمر ابھی ہرگز اتنی نہیں ہے کہ انھیں ایک کہنہ مشق مصنف سمجھا جائے لیکن ان کی تحریر کی سنجیدگی فکر کی گہرائی اور لہجے کی متانت نے انھیں ایک بزرگ اور تجربہ کار ادیب بنا دیا ہے۔ فراق کا ایک شعر ہے۔

آئے تھے ہنستے کھیلتے میخانے میں فراق
جب پی چکے شراب تو سنجیدہ ہو گئے

یہی کیفیت خالد سہیل کی ہے کہ وہ ادبی دنیا میں اپنے پیشے کی بے کیفی دور کرنے کے لیے آئے تھے کہ شعر و شاعری، کہانی اور قصہ گوئی سے ذہن کا تھوڑا بوجھ کم ہو جائے گا لیکن

rekhta

یہاں زندگی کے ایسے سخت مراحل اور محسوسات کی ایسی سطحوں سے سابقہ پڑا کہ ہونٹوں پر رہی سہی مسکراہٹ بھی طنز بن گئی۔ ایک عام انسان کی زندگی کا آج سب سے بڑا مسئلہ دو وقت کی روٹی ہے۔ اس کی دن بھر کی تمام تر جدوجہد کا مقصد اس کا اس دن کا رزق ہے اس کے حاصل کر لینے کے بعد وہ چین کی نیند سو جاتا ہے لیکن بعض لوگوں کے لیے اس بنیادی مقصد کا حصول بے شمار ایسے سوالات پیدا کر جاتا ہے اور ایسی بے چینی کو جنم دے جاتا ہے جو راتوں کی نیند اُڑا دیتی ہے۔ خالد سہیل بھی انھیں بے چین انسانوں میں سے ایک ہیں۔

خالد سہیل ایک ماہرِ نفسیات ہیں، یوں تو عام انسان کی زندگی میں لسانیات سے ناواقفیت کے باوجود 'لفظ' کی بڑی اہمیت ہے اس لیے کہ ترسیل کا سارا دارومدار لفظ پر ہے اگر وہی نہ رہے تو سب گنگ ہو کر رہ جائیں، عام زندگی میں یہ اہمیت صرف اظہار اور ترسیل کے لیے ہے لیکن ماہرِ نفسیات لفظ کو کسی اور طرح دیکھتا ہے اس کے لیے لفظ صرف اظہار یا ترسیل کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ ایک جہانِ معنی ہے جس کی تہوں میں شعور و لاشعور کی نہ جانے کتنی گرہیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے لیے لفظ لغت میں ملنے والا حروف کا وہ مجموعہ نہیں جس کے کچھ متعین معنی ہیں بلکہ محرومی، تشنگی، کامرانی و ناکامی، شکستگی، احساسِ کمتری و برتری، توہین و توقیر۔ ذہنی و تہذیبی کشمکش، خواب بیداری، آرکی ٹائپ اور نسلی لاشعور کا پرتو ہے، ماہرِ نفسیات کے لیے اس کی وہ اہمیت ہے جو انسان کے جسم میں نبض کی ہے کہ طبیب نبض دیکھ کر مرض کی کیفیت بتا دیتا ہے اور ماہرِ نفسیات زبان سے نکلے ہوئے لفظ سن کر مرض کی تشخیص کر دیتا ہے۔ اس کے لیے لفظ شخصیت کا پرتو ہے جس میں نہ جانے کتنی طرح کے رنگ لہریں لیتے نظر آتے ہیں۔

خالد سہیل اپنے اردگرد کے ماحول، اپنے موضوعات اور اپنے کرداروں کو ایک ماہرِ نفسیات کی طرح دیکھتے اور منتخب کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ہو یا افسانہ نگاری ان کے یہاں ایک بے چین زندگی کا پرتو ہر جگہ نظر آتا ہے اور یہی انھیں ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ نفسیات یوں تو جذباتِ انسانی کا مطالعہ کرتی ہے لیکن کسی شخص یا

موضوع کے رویّے کے مطالعے کے سلسلے میں اسے سماجیات سے الگ نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ کسی عہد کی سماجی صورتِ حال یا کسی شخص کا مخصوص ماحول اور حالات اس کے جذباتی رویّے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک عام انسان کن حالات میں ABNORMEL رویّے کا شکار ہو جاتا ہے اس میں اس کی جذباتی کشمکش کے ساتھ سماجی حالات کا دخل بھی ہو سکتا ہے اس لیے خالد سہیل کے افسانے صرف نفسیاتی ہی نہیں اپنے عہد کے سماجی رویّوں کے مطالعے کا بھی موضوع ہیں۔ اور آج کے زمانے میں جب دن بہ دن ہماری سوسائٹی COMPLEX ہی نہیں طرح طرح کی کشمکشوں کا شکار ہوتی جا رہی ہے ان رویّوں کا مطالعہ زیادہ ضروری زیادہ دلچسپ اور زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔

خالد سہیل کا ایک افسانوں کا مجموعہ 'زندگی میں خلا' اس سے قبل شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ ان کے افسانوں کے مجموعے انگریزی اور پنجابی میں شائع ہو چکے ہیں۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' ان کے دو ناولٹ کا مجموعہ ہے جس میں پہلا ناولٹ 'ٹوٹا ہوا آدمی' اور دوسرا ناولٹ 'مقدس جیل' ہے۔ یہ دونوں ناولٹ دو الگ الگ جذباتی اور سماجی کشمکشوں یا دو مختلف تجربوں کی تصویر ہیں۔ ان کی دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلا ناولٹ ایک مشرقی شخص کے مغرب کے تجربات اور وہاں کی سوسائٹی کے رویّوں اور طرزِ زندگی سے متعلق ہے اور دوسرا ناولٹ ایک مغربی خاتون کے بالکل مشرقی اور سخت مذہبی ماحول اور تصورات سے تصادم پر مبنی ہے۔

آج کی زندگی کی ستم ظریفی یہ ہے کہ مشرق کا ہر شخص مغرب، خاص طور پر امریکہ، کینیڈا پہنچ جانے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتا ہے اور وہاں رہنے والوں کو رشک کی نظروں سے دیکھتا ہے دوسری طرف مغرب کے رہنے والوں کے لیے عرب ممالک ان کی خوش حالی اور دولت مندی کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے ان کی کوشش رہتی ہے کہ وہ کسی طرح اس دولت کے شریک بن سکیں۔ یہ دونوں ناولٹ اسی کشمکش اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ ہیں۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' کا بنیادی کردار شہزاد ان پڑھے لکھے نوجوانوں کا نمائندہ ہے جو کسی نہ کسی طرح مجبوراً یا بہ خوشی امریکہ یا کینیڈا آ تو جاتے ہیں لیکن اپنے اندر اور باہر

کے تضاد سے رفتہ رفتہ اس طرح ٹوٹتے جاتے ہیں کہ ذہنی توازن کھو دیتے ہیں۔ شہزاد کے کردار کے ذریعے خالد سہیل نے جس طرح شمالی امریکہ کی سوسائٹی کی تصویر کشی کی ہے اسے پڑھ کر عبرت ہوتی ہے۔ ایک ایسی سوسائٹی جو اوپر سے بے حد دلکش اور خوبصورت نظر آتی ہے وہ کس قدر اذیت ناک اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے خالی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ باہر سے نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسا ملک جہاں قانون کا احترام سب سے زیادہ کیا جاتا ہے اور جو حقوق انسانی کے تحفظ کا دم بھرتا ہو وہ انسانی جذبے سے اس قدر عاری ہو سکتا ہے کہ غریب جولی کی موت کا سبب بن جائے یا شہزاد کی ذہنی صحت اور نیک چلنی کے باوجود اسے سخت نگرانی والے دماغی اسپتال میں بھیج دے۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ اس معاشرے کے غیر متوازن ہونے کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف تمام اخلاقی پابندیوں سے بری سوسائٹی اور دوسری طرف سخت اور بے لوچ ضابطے ان دو میں جس کا بھی کوئی شکار ہو جائے پھر اس کے لیے خودکشی کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ حالانکہ خود خالد سہیل کے بیان کے مطابق وہاں کی سوسائٹی میں ۹۶ فیصد حقوق انسان کو حاصل ہیں۔

خالد سہیل نے اس ناولٹ میں بڑی خوبصورتی اور جرأت کے ساتھ اس معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ آج شمالی امریکہ میں مہاجرین کا مسئلہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے وہاں کی سوسائٹی میں مہاجرین کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ وہ کس طرح اور کس حد تک بدلی ہوئی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے سمجھوتہ کر سکتا ہے؟ یہ کشمکش اولاد خاص طور پر لڑکی کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ خالد سہیل نے اس سوسائٹی کے بہت سے پہلوؤں کو دکھانے کی کوشش کی ہے جن میں بعض مشرق کے قاری کے لیے ہوش رُبا ہو سکتے ہیں۔

وہ ڈاکٹر اور ماہر نفسیات ہیں اس لیے اسپتال اور مریضوں کی کیفیتوں سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ اُن تمام چیزوں کو انھوں نے بڑی فنکاری اور یقین کے

ساتھ پیش کیا ہے۔ 'ٹوٹا ہوا آدمی' کی کردار نگاری خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس کے بعض کردار عرصے تک یاد رہنے والے ہیں۔

دوسرا ناولٹ 'مقدس جھیل' ایک طویل افسانہ ہے۔ جس میں 'ٹوٹا ہوا آدمی' کے مقابلے میں پیچ و خم کم ہیں۔ اس کا سبب ممکن ہے یہ ہو کہ یہ کہانی ایک ایسے منظرنامے پر ابھرتی ہے جہاں ریت، تیل اور کھجور کے علاوہ ہر چیز باہر سے آتی ہے، جہاں اس طرح کا بے باک اور کھلا ہوا سماج نہیں ہے جس کی مثالیں مغرب میں ملتی ہیں۔ لیکن ضابطے اور قانون پر اس کی پابندی اور اس پر عمل درآمد پوری سختی سے کی جاتی ہے۔ جہاں کی زندگی میں روپے کی فراوانی کے علاوہ کوئی دلکشی نہیں ہے اور کم از کم وہ تمام چیزیں عنقا ہیں، جن کا ایک مغرب میں رہنے والا عادی ہو سکتا ہے۔

مقدس جھیل ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو پلی اور بڑھی تو شمالی امریکہ میں لیکن دولت حاصل کرنے کی خواہش میں ایک ایسے ملک میں چلی آئی جہاں کی زمین میں کہانیاں بھی نہیں اُگتی ہیں اس کہانی کا بنیادی کردار تو ورانیکا ــــ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ بہت سے چھوٹے کردار سامنے آتے ہیں جن کے ذریعے مشرق و مغرب کے تضاد کو ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان دونوں کہانیوں میں اہم چیز انسانی نفسیات اور اس کی پیچیدگی ہے جس کو خالد سہیل نے بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ ان کہانیوں کی خوبی مصنف کا خلوص اور غیر متعصبانہ رویہ ہے جس کے بغیر کوئی اچھی کہانی جنم نہیں لے سکتی۔ خالد سہیل نے شمالی امریکہ کے سماج اور وہاں کی تہذیبی شکست و ریخت کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اسے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان ناولٹ میں پیش کیا ہے۔ اردو افسانے سے دلچسپی رکھنے والوں کو ان ناولٹ میں یقیناً موضوع کے نئے پن کے ساتھ بیان کی تازگی کا احساس ہوگا۔

دہلی ۱۷ر جنوری ۹۰ء

پگڈنڈی سے شاہراہ تک

مختصر کہانیوں کی پگڈنڈی پہ چلتے چلتے میں نے اپنے آپ کو اس موڑ پر کھڑے پایا جہاں اپنے مشاہدات، تجربات اور احساسات کو مختصر کہانی کے پیکر میں ڈھالنا میرے بس میں نہ تھا میرا قلم اور ذہن ہمت ہارنے لگے میں کچھ آگے بڑھا تو مجھے طویل کہانی کی شاہراہ نظر آئی۔ اس راستے سے ناآشنا تھا چنانچہ ہچکچایا لیکن پھر میں نے زندگی اور فن کے اس نئے چیلنج کو قبول کرلیا اور دو طویل کہانیاں تحریر کیں۔ پہلی کہانی "ٹوٹا ہوا آدمی" تو مجھے دو دفعہ تخلیق کرنی پڑی کیونکہ پہلی دفعہ میرے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔

اپنی دونوں طویل کہانیوں "ٹوٹا ہوا آدمی" اور "مقدس جھیل" کو میں نے ایک ہی کتاب میں یکجا کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ یہ دونوں کہانیاں درپردہ اتنی مختلف نہیں جتنی بظاہر نظر آتی ہیں دراصل یہ ایک ہی جدوجہد کے دو مختلف روپ ہیں۔ پہلی کہانی میں مشرق کا ایک جوان مرد مغرب میں آبستا ہے اور دوسری کہانی میں مغرب کی ایک جوان عورت چند مہینوں کے لیے مشرق میں پڑاؤ ڈالتی ہے۔ گھر کو چھوڑنا، نئے ماحول میں قدم رکھنا، نت نئے مسائل کا شکار ہونا، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا سہارا لینا اور ہر موڑ پر زندگی سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرنا دونوں ہی مشترک ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں انسانوں کی داخلی اور خارجی، ذاتی اور معاشرتی، انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے اٹوٹ رشتوں کی ترجمان ہیں۔

اپنی پہلی کہانی "ٹوٹا ہوا آدمی" میں میں نے اپنی مغرب کی دس سالہ زندگی کے تجربات کی چند جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ماہر نفسیات ہونے اور مختلف ہسپتالوں میں کام کرنے کی وجہ سے مجھے زندگی کے ان گوشوں میں جھانکنے کا موقع ملا جو

rekhta

عام لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ہم ہر روز بہت سے ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جو اندر سے ٹوٹ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ پورے معاشرے کے لیے ایک چیلنج ہیں ہمارے پاس ان کا کوئی علاج نہیں' PSYCHIATRIC SYSTEM کے پاس' نہ LEGAL SYSTEM کے پاس' نہ FAMILY SYSTEM کے پاس اور نہ ہی SOCIAL WELFARE SYSTEM کے پاس۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے ہر نظام مسائل کو دوسرے نظام کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب سارے نظام ناکام ہو جاتے ہیں اس وقت بعض دفعہ زندگی پراسرار طریقوں سے منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جب انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر خلوص نیت سے قدم بڑھانا شروع کرتا ہے تو زندگی کے مہربان دروازے خود بخود کھلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ جب انسان پرانے رشتوں سے مایوس ہونے لگتا ہے تو نئے رشتے اپنا دامن پھیلا دیتے ہیں۔ "ٹوٹا ہوا آدمی" پرانے رشتوں کے ٹوٹنے اور انسان کے اپنی ذات اور کائنات سے نئے رشتے جوڑنے کی کہانی ہے جن میں بیسویں صدی کے انسان کے ہجرت کے غم اور خوشیاں مستزاد ہیں۔ یہ انسانی مصائب کی طویل رات کی کہانی ہے جس کی کوکھ سے امیدوں کے سورج کی کرنیں جنم لیتی ہیں۔

دوسری کہانی "مقدس جیل" میں میں نے اپنے مشرق وسطیٰ کے سفر اور اپنی ایک دوست کے سعودی عرب میں ملازمت کرنے کے تجربات اور احساسات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں مشرق وسطیٰ اور خصوصی طور پر سعودی عرب کی معاشرتی زندگی پر سنجیدگی سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس خطے کی سیاسی اور مذہبی حیثیت اس قدر جذباتیت کا شکار ہے کہ وہاں کی داستانیں لکھنے والے انسانی حقوق اور خصوصاً عورتوں کے حقوق کا ذکر نہیں کرتے چاہے وہ مشرق کے مسافر ہوں یا مغرب کے بیشتر سب بہت سے انسانی مسائل سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔ یا تو وہ اس معاشرے کو رنگین عدسوں سے دیکھتے ہیں اور یا اقتصادی اور سیاسی مصلحتیں ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے نسلی تعصبات اور معاشرے میں انسانی حقوق کی پامالی کا ذکر تو سب کرتے ہیں لیکن سعودی عرب میں جو انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں ان کے بارے میں نہ تو کوئی

گفتگو کرتا ہے نہ ہی قلم اٹھاتا ہے۔ اگر ہم HUMAN RIGHTS کے بین الاقوامی مولف کی کتاب WORLD HUMAN RIGHTS GUIDS دیکھیں جو UNITEDNATIONS کے اصولوں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ جہاں سویڈن میں شہریوں کو ۹۸ فی صد اور کینیڈا میں ۹۶ فیصد انسانی حقوق حاصل ہیں وہاں جنوبی افریقہ کے شہریوں کو ۲۲ فی صد اور سعودی عرب میں رہنے والوں کو ۲۸ فی صد حقوق حاصل ہیں۔

میرا اس کہانی لکھنے کا مقصد کسی کے مذہبی یا روحانی جذبات کو مجروح کرنا نہیں میں صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ماحول اور معاشرہ جہاں لاکھوں انسان انسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کی روشنی حاصل کرنے جاتے ہیں انہی شہروں کی گلیوں اور بازاروں میں آج بھی انسان ظلم کے اندھیروں میں زندگی گزار رہے ہیں۔

روشنی بھی ہوئی سی' زندگی اک امتحاں
مسجدیں پُر نور لیکن شہر میں تاریکیاں

آخر میں میں صرف یہ عرض کروں گا کہ مجھے ذاتی طور پر یہ دونوں کہانیاں بہت عزیز ہیں میں نے انہیں بڑے شوق سے لکھا ہے اور بڑے فخر سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں مجھے امید ہے کہ یہ کہانیاں آپ کو پسند بھی آئیں گی اور ان حالات اور کرداروں کے بارے میں نئے انداز میں سوچنے پر اکسائیں گی بھی۔

میں شارب ردولوی صاحب کا بہت مشکور ہوں جن کی کرم فرمائیوں کے بغیر یہ کہانیاں میرے میز کی دراز میں تو پڑی رہتیں آپ کے ہاتھوں تک نہ پہنچتیں۔

خالد سُہیل

نومبر ۸۹ء

وِھٹ بی، کینیڈا

ٹوٹا
ہُوا
آدمی

وہ زندگی کی حرارتوں سے
وہ اپنے گھر کی بشارتوں سے
وہ دوستوں کی رفاقتوں سے
وہ اپنی جاں کی صداقتوں سے

نہ جانے کب سے بچھڑ گیا ہے
وہ ٹوٹ کر اب بکھر گیا ہے

rekhta

کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

شہزاد دبے پاؤں سیڑھیاں اُترا اور آخری سیڑھی پہ آ کر رُک گیا۔ اس نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے حالات کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اس کی ماں تخت پر بیٹھی کلام پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ منحنی سے جسم پر سفید قمیص، شلوار، سفید دوپٹہ اور اس پر سفید شال کیونکہ سردیوں کا موسم تھا اور ویسے بھی انھیں آسانی سے ٹھنڈ لگ جاتی تھی۔ آنکھوں پہ موٹے موٹے شیشے کی عینک جسے وہ پڑھتے وقت استعمال کیا کرتی تھیں۔ ان کے سامنے قرآن کریم رحل پر رکھا تھا جسے انھوں نے تکیے پر احتیاط سے جما دیا تھا اور وہ خود ہل ہل کر تلاوت کر رہی تھیں۔ دائیں طرف پانی کا ایک گلاس تھا جس میں وہ ہر رکوع کے ختم ہونے کے بعد پھونک ڈالتیں۔ شہزاد کو اس حرکت سے بہت چڑ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی ماں بہت دقیانوسی ہیں جو یہ سمجھتی ہیں کہ دنیا کے سارے مسائل کا حل چاہے وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، اقتصادی ہوں یا سیاسی قرآن کریم میں ہے وہ ہر روز اس امید پر پانی دم کرتیں کہ اگر شہزاد اسے خلوص دل سے چالیس دن تک پیئے تو اس کے نصیب بدل جائیں گے، اسے ملازمت بھی مل جائے گی اور حالات بھی بہتر ہو جائینگے۔ اس کی ماں ہر روز وہ گلاس اس کے سرہانے رکھ آتیں۔ پہلے تو وہ روز لڑ جھگڑ کر واپس

کردیتا لیکن جب سے اس کے دوست سلیم نے اسے قائل کردیا تھا کہ اس کی ماں کا دل صاف اور نیت نیک ہے اور وہ اپنی سادگی میں اس کا بھلا چاہتی ہیں اس نے گلاس واپس کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ روز روز کی بک بک سے وہ بھی تنگ آگیا تھا، اس نے سوچا کہ اگر اس کو والدین کے ساتھ رہنا ہے تو اسے کچھ باتیں برداشت کرنا ہی پڑیں گی اور یہ پانی کا گلاس بھی ان باتوں میں سے ایک تھی۔ وہ ماں کو واپس تو نہ کرتا لیکن یا تو اسے بہا دیتا یا شراب میں ملا کر پی جاتا لیکن اس وقت وہ آخری سیڑھی پہ بیٹھا اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جب اس کی ماں قرآن کریم کی تلاوت ختم کرکے غسلخانے میں جائیں اور وہ تکیے کے نیچے سے چابی حاصل کر سکے۔ وہ اپنی دوست ریچل کی مدد کرنا چاہتا تھا جو ایک مالی بحران کا شکار تھی۔

ریچل کو وہ پچھلے پانچ برس سے جانتا تھا۔ ویسے تو وہ ٹورانٹو شہر میں بہت سی عورتوں سے واقف تھا لیکن ریچل وہ واحد عورت تھی جس سے جنسی طور پر وہ INVOLVE نہ تھا۔ ریچل کا قد چھوٹا اور جسم فربہ تھا، وہ دل کی اچھی تھی لیکن دیکھنے میں پرکشش نہ تھی۔ ایک زمانے میں وہ دونوں کوکین کے کاروبار میں ملوث تھے اور ان کا اصول تھا کہ کاروبار اور ذاتی تعلقات کو خلط ملط نہ کریں گے۔ اس لئے بیشتر مرد اور عورتیں جو اکٹھے کوکین کی خرید و فروخت کرتے تھے آپس میں سوتے نہ تھے۔ ریچل اور شہزاد ایک سال تک رفقائے کار رہے۔ اس کے بعد ریچل حاملہ ہوگئی اور کاروبار کو ترک کردیا لیکن ان کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ اسے وقت نے اور بھی پختہ کردیا۔

ریچل کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اس کی مخدوش حالت کو دیکھ کر کسی نے چلڈرن ایڈز سوسائٹی CHILDREN AIDS SOCIETY کو فون کردیا تھا اور وہ اس کے بیٹے ڈیوڈ کو یہ کہہ کر لے گئی تھی کہ ریچل ایک نااہل ماں ہے۔ ریچل ایک طویل عرصے سے اپنے بیٹے کو مستقل طور پر واپس لینا چاہتی تھی لیکن اس کی بے سروسامانی اور ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے حالات قابو میں نہ آرہے تھے۔ چلڈرن ایڈز سوسائٹی نے یہ شرط لگائی تھی کہ اگر وہ ایک ہی گھر میں چھ مہینے قیام کرے اور مالی پریشانیوں کا شکار نہ ہو تو وہ اس کا بیٹا اسے واپس کردیں گے ریچل کو ایک ہی گھر میں تین مہینے ہوگئے تھے لیکن اب اس کے پاس اس مہینے کا کرایہ نہ تھا۔

اس نے شہزاد کو فون پر بتایا تھا کہ اس مہینے اس نے کچھ رقم اپنی ماں کی بیماری پر اور کچھ ڈیوڈ کی سالگرہ پر خرچ کردی تھی، اور اگر اس نے دو دن اندر کرایہ نہ دیا تو اسے گھر سے نکل جانا پڑے گا۔

شہزاد کی ماں نے قرآن پاک کو بند کیا اور اٹھ کر غسلخانے چلی گئیں۔ شہزاد نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک اسے شاور کے کھلنے کی آواز نہ آئی، پھر اس نے خاموشی سے تکیے کے نیچے سے چابی نکالی، بیسمنٹ میں جا کر وہ لوہے کا ٹرنک کھولا جو وہ دس سال پہلے لاہور سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور اس کی ماں اب بھی ساری رقم اور سونا اسی میں رکھتی تھیں۔ ٹرنک کھولتے ہی اسے کپڑوں پر سو سو ڈالر کے دس نوٹ نظر آئے۔ اس نے صرف تین نکالے، ٹرنک کو آرام سے بند کیا، آرام سے تو نہیں زور لگا کر بند کرنا پڑا کیوں کہ اس کی ماں ضرورت سے زیادہ کپڑے ٹرنک میں ڈال دیتی تھیں۔ چابی کو دوبارہ تکیے کے نیچے رکھا اور باہر نکل گیا۔

وہ گھر سے نکل کر تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہ گیا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی ٹوپی اور دستانے گھر بھول آیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لئے رکا۔ "گھر جاؤں یا نہ جاؤں"۔ اس خیال پر تھوڑی دیر غور کیا۔ گھر جانے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر ماں غسل خانے سے نکل آئیں تو معاملہ بگڑ سکتا تھا لیکن اگر وہ واپس نہیں جاتا تو سردی سے ٹھٹھر جاتا۔ وہ کنیڈا میں دس سال سے رہ رہا تھا لیکن سردیوں کا عادی نہ ہوا تھا موزے اور کوٹ، ٹوپی، دستانے اسے کبھی یاد نہ رہتے۔ اس معاملے میں اس کی سست طبیعت زیادہ کارآمد نہ ہوتی۔ وہ "اماں غسلخانے میں بہت دیر لگاتی ہیں" سوچ کر واپس گھر آیا اور اپنے کمرے سے ضروری چیزیں لے کر دوبارہ نکل گیا۔

اس نے سب وے SUBWAY اسٹیشن سے ریچل کو فون کیا اور آدھے گھنٹے میں ڈاؤن ٹاؤن کے ایک بار سکینڈلز SCANDALS میں ملنے کا پروگرام بنایا وہ بار جس میں وہ اکثر ملا کرتے تھے۔

شہزاد سب وے میں بیٹھ کر دیوان غالب پڑھنے لگا۔ اس نے اس دیوان کی ایک

کاپی خصوصی طور پر لاہور سے منگوائی تھی جسے وہ ہر وقت اوور کوٹ کی جیب میں رکھتا تھا۔
اسے سب وے کا سفر بہت پسند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹورانٹو کا سب وے سسٹم پورے شمالی امریکہ کا بہترین سسٹم تھا کیوں کہ وہ صاف ستھرا بھی تھا اور محفوظ بھی۔ وہ ایک دو دفعہ نیویارک اور شکاگو کے سب وے میں گھوم چکا تھا جہاں وہ غلاظت، گداگروں اور بدمعاشوں سے پریشان ہوا تھا۔ اس نے دیوانِ غالب کھولا تو اسے سامنے ہی یہ شعر نظر آیا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے بہت آنکھیں جھپکیں لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور اس کا سر تکیے پر گر گیا۔
اُس نے ہاتھ ہلانے چاہے تو اسے احساس ہُوا کہ وہ بھی بستر سے بندھے ہیں۔ اسے اندھیرے میں تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو بوتلیں لٹکی ہُوئی تھیں، شاید ایک گلوکوز کی تھی اور ایک خون کی۔ وہ جلد ہی دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔
اُس نے پھر آنکھیں کھولیں تو اسے صبح کے آثار نظر آئے۔ ابھی بھی چاروں طرف خاموشی کے سائے گہرے تھے۔ اس نے دماغ پر زور دینے کی کوشش کی تو اسے بے ہوشی کے سمندر میں چند یادوں کے جزیرے ابھرتے نظر آئے۔ چند نام اور چند خیال بے ترتیبی سے قریب آنے لگے۔ رسمین ــ نیاگرا فال ــ رشید چچا ــ ریچل ــ اماں ــ ابھی یہ نام چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ اس کے لئے سوچنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔
نہ جانے وہ کتنی دیر کے بعد جاگا تو اسے چاروں طرف دھوپ نظر آئی۔ کھڑکی سے سورج

کی کرنیں اندر آرہی تھیں اور میز پر رکھے ہوئے پھولوں کو گدگدا رہی تھیں۔ اسے کسی کے قرآن پڑھنے کی آواز آئی، اس نے مڑ کر دیکھا تو ماں کو تلاوت میں منہمک پایا، وہ اس وقت بھی ہل ہل کر پڑھ رہی تھیں۔ شہزاد نے گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور رُخ بدل کر لیٹ گیا۔

وہ کہاں تھا اور وہاں کیا کر رہا تھا —؟ یہ سوال تو برسوں سے اس کے ذہن پر سوار تھے لیکن اس وقت ان کی اہمیت زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

وہ پرسلین کے ساتھ نیاگرا فالز گیا تھا — اس کی چچا سے لڑائی ہوئی تھی — ڈیرک نے اسے ایمفیٹا مین AMPHETAMINE کے انجکشن دیئے تھے — اس نے ریچل کے ساتھ ہنی مون بیڑ پیا تھا — وہ صبح اٹھا تھا تو میری کو اپنے پہلو میں پایا تھا — خیالات آہستہ آہستہ واقعات کا روپ دھار رہے تھے لیکن بڑی بے ترتیبی سے۔

سہ پہر کو نرس اس کے کمرے میں آئی تو اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں اور کب سے ہوں —؟"

"آپ اسکاربرو کے جنرل ہسپتال میں ہیں، تین دن آپ انٹینسو کیئر یونٹ INTENSIVE CARE UNIT میں موت و حیات کی جنگ لڑتے رہے اور اب پرائیویٹ روم میں منتقل ہو گئے ہیں۔"

"لیکن میں ہسپتال میں آیا کیوں تھا —؟" اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"تفصیل کا مجھے پتہ نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ آپ کی والدہ نے آپ کو خون میں لت پت پایا تھا، آپ نے اپنا بازو چاقو سے بری طرح زخمی کر لیا تھا، شاید خودکشی کا ارادہ ہو۔" یہ کہہ کر نرس واپس چلی گئی، اور وہ سوچ میں ایک بار پھر غرق ہو گیا۔ خودکشی، خون، اماں — یہ باتیں ابھی بھی معمّے سے کم نہ تھیں۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی سلیم نے ریسیور اٹھایا تو اسے آواز آئی۔

"دیکھو سلیم! میں شہزاد ہوں اور گمبھیر مسئلے کا شکار ہوں!"

"کیوں کیا ہوا۔" سلیم حیران تھا

"دیکھو زیادہ سوال مت پوچھو، میں ہسپتال میں ہوں اور یہ چڑیل نرسیں مجھے اس وقت تک نہیں جانے دیں گی جب تک کوئی دوست یا رشتہ دار مجھے لینے نہ آئے — اس لئے جلدی آجاؤ۔"

پہلے تو سلیم کے جی میں آئی کہ کہہ دے۔

"دیکھو شہزاد! میں تمھارا نوکر نہیں ہوں ———— تم مطلبی دوست ہو، پچھلے چار سال سے جب بھی تم مصیبت میں ہوتے ہو مجھے بلاتے ہو، کیا میں تمھاری زندگی کا ایمرجنسی ایگزٹ EMERGENCY EXIT ہوں یا جہاز کا لنگر —" لیکن پھر اس نے سوچا۔

"بے چارا دل کا اچھا ہے، میرے بھی کئی بار مصیبت میں کام آیا ہے، پہلے میں اس کی مدد تو کروں، باتیں بعد میں کروں گا —" اور — "اچھا میں آتا ہوں، مجھے پتہ تو بتاؤ۔"

سمجھ کر مصالحت کر لی اور اسے اپنے گھر لے آیا۔

سلیم کے گھر کو گھر کہنا لفظ "گھر" کی بے عزتی کرنا تھا۔ سب لوگ اسے بیسمنٹ اپارٹمنٹ BASEMENT APARTMENT کہتے تھے، لیکن شہزاد اسے "چوہے کی کھڈ" کہہ کر پکارتا تھا ــــ دو چھوٹے چھوٹے کمرے، اتنے تاریک کہ دن کو بھی بلب جلانا پڑے، نہ سورج کی روشنی، نہ تازہ ہوا کا گزر، ان باتوں کے باوجود سلیم خوش تھا کیوں کہ اسے صرف تین سو ڈالر ماہانہ کرایہ دینا پڑتا تھا۔ اس کی مالکہ بے چاری ایک بوڑھی بیوہ تھی جو اوپر کے حصے میں اکیلی رہتی تھی۔ اس کا نہ کوئی دوست تھا نہ رشتہ دار۔ اسے اولڈ ایج پنشن OLD AGE PENSION مل جاتی تھی اور سلیم سے تین سو ڈالر۔ سلیم خوش تھا کہ وہ کسی بڑھیا کی مدد کر رہا ہے، ویسے بھی اس نے جتنے اپارٹمنٹ دیکھے تھے کوئی بھی آٹھ سو ڈالر سے کم نہ تھا۔ وہ سوشل ورک میں پی ایچ ڈی کا اسٹوڈنٹ تھا اور مالی حالت اچھی نہ تھی بڑھیا بھی خوش تھی کہ اگر کسی دن اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا تو سلیم کم از کم اسے ہسپتال تو لے ہی جائے گا یا ایمبولنس کو فون کر دے گا۔ شہزاد کبھی کبھار مذاق میں کہا کرتا تھا۔

"سلیم! اس بڑھیا کو زہر دے دیتے ہیں پھر تم اور میں اس عالیشان گھر میں ٹھاٹھ سے رہا کریں گے"۔ سلیم ایسے مذاق سے زیادہ محظوظ نہ ہوتا تھا۔

شہزاد کو اس اپارٹمنٹ کی صرف ایک چیز پسند تھی، اور وہ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی قدِ آدم آئینہ تھا، وہ اکثر اس میں اپنی شکل دیکھ کر خوش ہوتا اور بال سنوارتا لیکن اس دن وہ آئینہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔

"کیا یہ میں ہوں ــــ؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

وہی شہزاد جو اپنے آپ کو ہمیشہ دراز قد اور وجیہہ نوجوان سمجھتا تھا ــــ اور کہا کرتا تھا۔

"میں وہ TALL, DARK AND HANDSOME مرد ہوں جس کی ہر گوری عورت تمنا کرتی ہے، اور خوابوں میں دیکھتی ہے!" لیکن اس دن آئینہ اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال گرد آلود، اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد، کئی دنوں کا شیو بڑھا ہوا۔

کپڑے میلے، کوٹ پر خون کے دھبے اور دانتوں پر کریچرا جمع ہوا تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں جن میں ایک شریر مسکراہٹ ناچا کرتی تھی، آسیب کے سائے لیے ہوئے تھے، اس کا پانچ فٹ آٹھ انچ اور ایک سو پچاس پونڈ کا جسم بیمار و مضمحل نظر آ رہا تھا۔

"زندگی ایک خبیث کتیا ہے ــــ!" شہزاد نے دیوار کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ جنت الفردوس سے نکلنے اور آدم کے پھل چکھنے کی کچھ تو قیمت ادا کرنی ہی ہے۔!"

سلیم نے اپنا اوور کوٹ ٹانگتے ہوئے کہا۔

"گناہ آدم نے کیا، اور سزا ہم بھگتیں"۔

"بیٹھو شہزاد! آرام سے باتیں کرتے ہیں ــــ چلو میں تمھیں چائے پلاؤں ــــ بات صرف سزا کی ہی نہیں ہم اپنے آبا و اجداد کی محنت کا پھل بھی کھاتے ہیں"۔

سلیم دیکھ رہا تھا کہ شہزاد کی ذہنی اور جسمانی حالت ٹھیک نہیں، وہ اسے غصے میں تو کئی دفعہ دیکھ چکا تھا لیکن اس دن اس کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر جب شہزاد قدرے سنبھلا تو سلیم نے پوچھا۔

"بتاؤ کیا ہوا تھا ــــ؟ یہ خودکشی کی نوبت کیسے آئی ذرا تفصیل سے بتاؤ؟"

اس وقت تک شہزاد پچھلے چند دنوں کے واقعات کی کڑیاں جوڑ چکا تھا۔

"وہ ایک خواب تھا جو حقیقت بن گیا ــــ ڈراؤنا خواب ــــ اور ــــ زہریلی حقیقت ــــ وہ ذلیل کرسٹین، وہ خبیث چچا رشید اور وہ بے ایمان رنجیت سنگھ ان سب نے مل کر مجھے موت کے دہانے پر پہنچا دیا ہے"۔ اور وہ اٹھ کر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

وہ جب بھی جذباتی تناؤ کا شکار ہوتا چڑیا گھر کے جانوروں کی طرح آگے پیچھے پھرنے لگتا۔

سلیم نے دوسرے کمرے سے چائے بناتے ہوئے تنبیہ کی۔

"شہزاد! آخر تم کب بدلو گے ــــ؟ خراب کاموں کے خراب نتائج ــــ مجھے ڈر ہے کہ اگر تم نے اپنا طرزِ عمل نہ بدلا تو یا تو جیل میں پہنچ جاؤ گے یا پاگل خانے میں ــــ یہ

پاکستان نہیں کینیڈا ہے، یہاں قوانین پر عمل کیا جاتا ہے۔"

سلیم چائے لے کر آیا تو شہزاد جا چکا تھا۔ میز پر ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا ۔

زندگی اپنی جب اس طور سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

شہزاد اپنی نقاہت کے باوجود سب وے اسٹیشن کی طرف چلتا رہا اور سوچنے لگا کہ وہ نہ جانے کتنے محاذوں پر بیک وقت جنگ لڑ رہا تھا اور پچھلے دنوں اسے ہر محاذ پر سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہر شخص کی ہمت اور صبر کی ایک حد ہوتی ہے، شہزاد کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا، وہ یہ مشکلات مزید برداشت نہ کر سکتا تھا اس لئے اندر سے ٹوٹنے لگا تھا۔

"کیا یہ صرف میرا المیہ ہے ___؟ یا ہر مہاجر کا ___؟ یا ہر بیسویں صدی کے انسان کا ___؟" وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

پچھلے چند دنوں سے وہ اس الجھے کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ گتھی جتنی سلجھانے کی کوشش کرتا وہ اتنی ہی الجھتی جاتی۔ وہ بچپن میں نانی اماں کے اون سے کھیلا کرتا جس کا ایک سرا گم ہو جاتا تو وہ گھنٹوں اسے تلاش کرتا رہتا، وہ جانتا تھا کہ سرا اس کے سامنے ہے لیکن نظر نہیں آتا۔

وہ گھر سے یہ سوچ کر نکلا تھا کہ ریچل کو سکینڈ لز کلب میں ملے گا، ڈالر اس کے حوالے کر دیگا اور واپس آجائے گا۔ وہ ریچل کے ساتھ بیٹھا بیئر پی رہا تھا کہ اس کی ملاقات ڈیرک سے ہو گئی جس نے اسے کونے میں لے جا کر بتایا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے مونٹریال کے ایک ہسپتال میں چھاپہ مارا تھا اور ایمفیٹامین کے انجکشنوں کا ڈبہ غصب کر لیا تھا، اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا اور یہ سوچتے ہوئے "اگر کچھ ڈالر بن گئے تو چپکے سے اماں کے تین سو ڈالر واپس کر دوں گا۔" اپنے ڈیلروں کو آشوا، سکاربرو، ڈاؤن ٹاؤن اور مسیساگا فون کیا تھا اور بیس بیس انجکشن بیچنے کا بندوبست کر لیا تھا۔

ایک دن میں ہزار ڈالر بن جائیں تو برا ہی کیا ہے، جیب میں پیسے نہ ہوں تو انسان خیرات

بھی نہیں دے سکتا۔" یہ خیال اس کے دماغ سے گزرا اور اس نے ریچل کے پاس واپس آکر ایک اور ہینی کین بیئر کا آرڈر دیا۔

ریچل جو ایک زمانے میں خود اس کالے کاروبار میں ملوث تھی، سب سمجھتی تھی۔

"شہزاد! کوئلے کے کاروبار میں سب کا منہ کالا ہو جاتا ہے، کسی کا جلد کسی کا بدیر۔"

شہزاد نے مسکرا کر گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔

ریچل تو تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی لیکن وہ کافی دیر تک بیئر پیتا رہا تھا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو میری کے بستر میں پایا۔

"میں یہاں کیسے پہنچا ___؟" اس نے کس معصومیت سے یہ سوال کیا تھا۔ وہ نہ جانے کتنی ہی عورتوں سے کتنے موقعوں پر یہ سوال پوچھ چکا تھا۔

"میرا خاوند کیلی فورنیا گیا ہوا ہے ___ تم کل رات ملے تو میں اپنے ساتھ لے آئی۔ ویسے تم نہ تو آتے ہو اور نہ ہی فون کا جواب دیتے ہو ___"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے، اس نے فوراً کپڑے بدلے اور بھاگ کھڑا ہوا۔

"چائے تو پیتے جاؤ ___" میری کہتی گئی لیکن وہ۔

"مجھے ڈاؤن ٹاؤن ضروری کام سے بارہ بجے پہنچنا ہے۔" کہتا ہوا کوٹ پہننے لگا۔

"کبھی کبھار ٹیلی فون کر لیا کرو!" میری آخری بار چیخی اور وہ۔

"اوکے، اوکے۔" کہتا سیڑھیاں اُتر گیا۔

اس نے ڈیرک سے بائیس انجکشن لئے، بیس ڈیلروں کو دے دیئے، دو اپنے موزوں میں اڑس لئے اور ہزار ڈالر جیب میں ڈال لئے۔

وہ خوش خوش سب وے سٹیشن کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں رنجیت سنگھ مل گیا جو ایک کونے میں دیوار سے لگا کھڑا تھا، اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

"کیا ہوا رنجیت ___؟" اس نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔

"ستارہ گردش میں ہے، جگجیت میرے دو ہفتے کی تنخواہ کھا گیا، میں نے اصرار کیا تو جھگڑا ہو گیا

ہاتھا پائی ہوئی، اس نے دو گورے غنڈوں کو بلا کر مجھے پٹوایا اور پولیس کو فون کر کے بتایا کہ میں یہاں غیر قانونی طور پر رہ رہا ہوں!"

شہزاد کو بہت دھچکا لگا — اس نے ہی رنجیت کو وہ ملازمت دلوائی تھی، رنجیت غیر قانونی تھا لیکن دل کا مخلص تھا، اس نے شہزاد کی جھگڑوں میں کئی دفعہ مدد کی تھی — اور اس کے لئے خطرے مول لئے تھے۔ شہزاد نے جیب سے ہزار ڈالر نکال کر اور کاغذ پر ایک ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیا۔

"رنجیت! تم فوراً ونکوور VANCOUVER چلے جاؤ اور اس دوست کو فون کرو، وہ تمہیں چند ہفتوں کے لئے پناہ دے دیگا، ویسے میں نے سُنا ہے کہ حکومت تمام غیر قانونی لوگوں کو پناہ دینے والی ہے!"

اس کی طبیعت ایک دفعہ پھر مکدر ہو گئی تھی۔ اسے برسوں سے یہ بات سمجھ نہ آئی تھی کہ ایشیائی مہاجر ایک دوسرے کے اتنے دشمن کیوں ہوتے ہیں — یہ مدد کرنا تو کجا ایک دوسرے کی خوشی بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اور چند ٹکوں یا جھوٹی شہرت کی خاطر ایک دوسرے کا گلا کاٹنے یا کمر میں چھرا گھونپنے سے دریغ نہیں کرتے۔

وہ اسی بُرے موڈ میں گھر پہنچا اور سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ اسے ماں، باپ، چچا اور چچی کھانا کھاتے ہوئے نظر آئے۔ اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

"بیٹا — ! خدیجہ چچی آئی ہیں، انھیں سلام کرو۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رُک گیا — اسے اس چچا اور چچی سے سخت نفرت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ انھوں نے ہی اس کے والدین کو کینیڈا بلا کر ان کی زندگی تباہ کی تھی۔

"اگر ہم ہمیشہ پاکستان میں رہتے تو شاید اتنے تباہ حال نہ ہوتے۔" وہ کبھی کبھار ہر ناکام مہاجر کی طرح سوچتا۔ چچا کو دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا۔ اس کا اپنا بیٹا لندن میں ایک انگریز عورت کے ساتھ بغیر شادی کے رہ رہا تھا جس سے وہ بہت مجبور تھا اور اپنا غصہ شہزاد کو نصیحتیں کر کے نکالتا تھا۔ اس نے شہزاد کے والد کے بھی کان بھرنے شروع کر دیئے تھے اور وہ بھی اب نصیحتیں کرنے لگے تھے۔

"بیٹا! اندر چلے آؤ —" خدیجہ چچی نے کہا تو اس نے خاموشی سے تعمیل کی۔

"کیا حال ہے بیٹا —؟" چچی نے پوچھا تو اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا

"میں پریشان ہوں — ! میرا ایک دوست مصیبت میں ہے، پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے!"

"ضرور غیر قانونی ہوگا۔" چچا نے ویل چیئر میں پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "تم ان مجرموں کے ساتھ رہو گے تو ایک دن ویسے ہی ہو جاؤ گے!"

"وہ دل کا بہت اچھا آدمی ہے!"

"تمہاری طرح، جس نے اپنی ماں کو بھی نہ بخشا اور تین سو ڈالر چرا لئے۔"

شہزاد کا خون کھولنے لگا تھا — اس کے چچا نے غلط وقت پر حملہ کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور اس نے میز کے قریب آ کر کہا

"تم ذلیل آدمی، شرم نہیں آتی، ایک تو ہمیں کینیڈا بلا کر ذلیل و خوار کیا اور اوپر سے میرے ہی گھر میں آ کر مجھ پر ہی حملے کرتے ہو — دفع ہو جاؤ میرے گھر سے۔" یہ کہتے ہوئے میز پوش کو پکڑا۔

"یہ میرے بھائی اور میری بھابی کا گھر ہے!"

"یہ میرا اور میرے والدین کا گھر ہے، تم اپنی منحوس شکل لے کر نکل جاؤ!" اس نے میز پوش کو اس زور سے کھینچا کہ سارا کھانا چچا پر الٹ گیا۔

"تم شرابی، زانی ......" اس کا چچا بھی غصے میں تھا۔

شہزاد بڑھ کر طمانچہ مارنے والا تھا کہ اس کا باپ راستے میں آگیا۔ وہ پلٹا اور اُلٹے پاؤں گھر سے نکل گیا۔

گلیوں میں پھرتے ہوئے "شرابی، زانی" کے الفاظ اس کے کانوں اور ذہن میں گونجتے رہے —

وہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں گھنٹوں بے چینی سے پھرتا رہا، ذہن میں ماضی کے کتنے واقعات آئے اور گزر گئے، کتنے عکس اُبھرے اور ڈوب گئے۔ اسے بچپن کے وہ دن یاد آئے جب وہ لاہور کی پُرانی انارکلی میں ایک خستہ حال مکان میں والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اتنے غریب تھے کہ رات کو گھر میں تیل کا دیا یا موم بتی جلا کرتی تھی اور وہ سڑک کے بلب کے نیچے اسکول کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ اس کا دوست حمید جو ساتھ والے محلہ میں ایک شاندار گھر میں رہتا تھا، کبھی کبھار اسے بلاتا بھی تو وہ ندامت سے جا نہ پاتا۔ اسے اپنے میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر شرم آتی۔ وہ سوچا کرتا کہ نام تو اس کا شہزادہ ہے لیکن اس کا دوست شہزادوں کی طرح رہتا ہے۔ اس کا دوست اپنے باپ کے ساتھ اسکوٹر یا کار میں بیٹھ کر اسکول جاتا اور وہ پیدل چلتا۔

اسے محرم کے وہ دن بھی یاد آئے جب حمید کالے کپڑے پہن کر سوگ مناتا، تو وہ سوچتا۔

"سوگ تو مجھے منانا چاہیے جو غربت میں رہتا ہوں۔" اور قدرت یا خدا کی ستم ظریفی

پر ہنس دیتا۔

اسے وہ دور بھی یاد تھا جب اس کی سعیدہ خالہ ہر جمعرات اس کو داتا دربار لے جاتیں وہاں نمک کھاتیں، جھاڑو دیتیں اور رو رو کر دُعائیں مانگتیں۔ اسے بعد میں پتہ چلا کہ وہ اولادِ نرینہ کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ اس کے خالو نے مشورہ دیا تھا۔

"بیگم! چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" لیکن خالہ نے جواب دیا تھا

"جب مریم کو خدا نے بیٹا دیا ہے تو مجھے کیوں نہیں دے سکتا۔" اور وہ برسوں یہ سمجھتا رہا تھا کہ چوں کہ اس کی ماں کا نام مریم تھا خالہ اپنی بہن کا ذکر کر رہی تھیں لیکن اسے بعد میں پتہ چلا کہ وہ حضرت عیسٰی کی ماں کا ذکر کیا کرتی تھیں۔

اسے وہ شام بھی یاد تھی جب اس کے ساتھ والی گلی کی جوان عورت اپنے دوست کو لے کر انارکلی کے پاس سے گزر رہی تھی تو اس عورت کے بھائی نے اپنی بہن کو غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے اس مرد کی اتنی پٹائی کی تھی کہ وہ لہولہان ہو گیا تھا۔ اس کی بہن بہت کہتی رہی کہ یہ بہت اچھا انسان ہے لیکن وہ اس کے بھائی کی غیرت کی بات تھی۔

وہ جوں جوں اپنے ماحول کی روایات سے واقفیت حاصل کرتا رہا اس کا سکون فضاؤں میں تحلیل ہوتا گیا۔ توہم پرستی، جہالت، دولت کی غیر مساوی تقسیم اور بیماری کے زخم چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے جو چیز اسے سب سے زیادہ کھٹکتی تھی وہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر ظلم تھا۔ اسے یوں لگتا کہ وہ جس ماحول میں پل بڑھ رہا ہے وہاں نہ تو مذہب کا اور نہ حکومت کا کوئی قانون چلتا ہے کوئی قانون ہے تو بس ایک ہی — جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

مُلک میں پہلی دفعہ الیکشن ہوئے تو وہ بہت خوش ہوا تھا لیکن چار سال بعد دوبارہ الیکشن ہونے لگے تو اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور پھر جلد ہی مارشل لاء لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ پاکستانیوں اور مسلمانوں کو الیکشن راس نہیں آتے کیوں کہ وہ ان کے مزاج کے خلاف ہیں، انھیں صدیوں سے جبر و تشدد اور ڈکٹیٹر شپ کی عادت پڑ گئی ہے۔ آقا اور غلام کا وہ واحد رشتہ ہے جس کے وہ عادی ہیں، چاہے کوئی عبداللہ ہو، عبدالرشید ہو، غلام نبی ہو، غلام رسول ہو، حکومت کا غلام ہو یا بیوی کا غلام — انسانوں کی آزادی اور برابری ابھی

اس قوم کی معاشرت اور سیاست کا حصّہ نہیں بنی۔

وہ اس ماحول سے غمزدہ تھا لیکن پھر بھی اس کا اپنا ماحول تھا اور جیسے روگی کو اپنے دکھ اور غم بھی عزیز ہوتے ہیں اسے بھی وہ دکھ سکھ پسند تھے کیوں کہ وہ اس کے اپنے تھے۔ ان سے اس کا ایک رشتہ تھا، دُنیا کا ہر انسان اُن غموں اور تکلیفوں کو مسکراتے ہُوئے برداشت کرتا ہے جن سے اسے اپنائیت کی بُو آتی ہے۔

اس نے فلسفہ میں بی۔اے۔ پاس کیا تو اس کے رشید چچا اور خدیجہ چچی نے اس کے والدین کو کینیڈا بلا لیا تھا، جیسے بہت بڑا احسان کیا ہو، والدین خوش تھے گویا ہیرے کیچڑ سے نکل کر تاج میں جڑنے والے ہوں لیکن وہ ہیرے کیچڑ سے تو نکل آئے تاج میں نہ جڑ سکے ان کا تعلق ماضی سے ٹوٹ گیا لیکن مستقبل سے نہ جُڑ سکا تھا۔ وہ کہیں کے نہ رہے تھے۔ وہ اس بھیڑ کی طرح محسوس کرتا جو اپنے ریوڑ سے ٹوٹ چکی ہو۔

اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے ایک کاغذ پر کرسٹین کا فون نمبر ملا۔ کرسٹین اس کی ان شادی شدہ محبوباؤں میں سے ایک تھی جن کے شوہر اگر شہر سے باہر ہوتے تو وہ اسے اپنی خواب گاہ میں دعوت دیتیں۔

اس نے فون کیا تو خوش قسمتی سے کرسٹین گھر پر تھی، کہنے لگی کہ اس کا خاوند شکاگو ایک کانفرنس کے سلسلے میں گیا ہوا ہے:

"آؤ مجھے لے جاؤ! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں، میں سکاربرو ٹاؤن سینٹر میں سینما تھیٹر کے پاس تمہارا انتظار کروں گی۔"

شہزاد نے کرسٹین کو اپنے بارے میں بہت سے جھوٹ بتا رکھے تھے جو کبھی کبھار اسے کانٹا بن کر چبھتے تھے

کرسٹین پہنچی تو شہزاد اس کا منتظر تھا، غمگین و اُداس۔ کرسٹین نے بڑے تپاک سے اسے گلے لگایا لیکن اس نے بڑے دھیرے سے اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔

"اچھا ہوا تم آگئیں ورنہ جانے کیا ہو جاتا۔"

کرسٹین نے خاموشی سے اسے کار کی چابی دی اور وہ ڈرائیورز سیٹ پر بیٹھ گیا، کرسٹین

ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر اس کے بالوں سے کھیلنے لگی۔

شہزاد کافی دیر کی خاموشی کے بعد بولا۔

"کرسٹین! میں اندر سے ٹوٹ رہا ہوں!" اس کے لہجے میں اتنا دکھ تھا کہ کرسٹین نے اپنے شانے پر سر رکھ دیا۔

"میں تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں کرسٹین۔ پچھلی ملاقاتوں میں میں نے تمہیں دھوکے میں رکھا تھا آج مجھے زہر اگلنا ہے!"

کرسٹین خاموشی سے تکتی رہی۔

"میرے اندر ایک آتش فشاں ہے جو اب تک خوابیدہ تھا لیکن اب پھٹنے کو ہے۔"

وہ پھر بولا۔ "کیا ہم ہملٹن جانے سے پہلے نیاگرا فال نہ چلیں۔ مجھے جب بھی بڑا دکھ یا بڑی خوشی ہوتی ہے تو وہاں جاتا ہوں!"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" کرسٹین کو تو بس اس کی قربت کی خواہش تھی۔

شہزاد نے ایکسلریٹر ACCELERATOR پر پاؤں رکھا — سپیڈومیٹر پر کلومیٹر نظر آنے لگے۔ سو — ایک سو دس — ایک سو بیس — ایک سو تیس —

"ہم بہت تیز جا رہے ہیں —" کرسٹین نے اس کے رخسار تھپتھپاتے ہُوئے توجہ دلائی۔ وہ چند لمحوں کے لئے آہستہ ہوا لیکن پھر تیز ہو گیا۔

"میرے اندر نفرتوں کا سیلاب ہے۔" اس نے سپیڈ کچھ اور بڑھا دی۔ کرسٹین، بے چینی سے سیٹ پر پہلو بدلنے لگی۔

اتنے میں انہیں پولیس کی کار کا سائرن سُنائی دیا جو ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ شہزاد نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور پولیس افسر کا انتظار کرنے لگا۔

پولیس افسر نے پہلے شہزاد اور کرسٹین پر نگاہ ڈالی، پھر پچھلی سیٹ کو اپنی آنکھوں سے ٹٹولنے لگا۔ وہ شراب کی ٹوہ میں تھا۔

"کیا میں آپ کا ڈرائیونگ لائسنس دیکھ سکتا ہوں۔"

شہزاد نے دھیرے سے جیب سے پرس نکالا اور کئی کاغذ ٹٹولنے کے بعد لائسنس

دے دیا۔

"کیا میں کار کی انشورنس اور رجسٹریشن دیکھ سکتا ہوں۔؟"

کرسٹین نے گلو باکس GLOVE BOX سے گھبرا کر کاغذ نکال کر دیئے۔

"آپ سو کلو میٹر کے زون میں ایک سو بیس کلو میٹر کی سپیڈ سے ڈرائیو کر رہے تھے۔۔۔!"

شہزاد خاموش رہا۔

پولیس افسر کاغذات لے کر اپنی کار میں چلا گیا۔

دونوں کافی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

"میرا ریکارڈ بہت خراب ہے!" شہزاد نے اتنی بے اعتنائی سے کہا جیسے کہہ رہا ہو "موسم بہت خراب ہے"۔ کرسٹین سمجھی کہ اسے ایک آدھ پارکنگ ٹکٹ مل گیا ہوگا۔ اس نے سوچا

"وہ ایک ذمہ دار سوشل ورکر ہے، غیر قانونی کام تو نہ کرتا ہوگا۔" کار میں صبر آزما خاموشی تھی۔۔

کافی دیر کے بعد پولیس افسر آیا اور شہزاد سے مخاطب ہوا۔

"مسٹر ملک! کمپیوٹر ریڈنگ کے مطابق آپ نے

پندرہ پارکنگ ٹکٹ ادا نہیں کئے

آپ کو تین سپیڈنگ ٹکٹ مل چکے ہیں

آپ کے دس نمبر کٹ چکے ہیں اور اب آپ کا ڈرائیونگ لائسنس ایکسپائر EXPIRE ہو چکا ہے۔ آپ کار نہیں چلا سکتے۔ آپ صرف اسی صورت میں آگے جا سکتے ہیں اگر کار کی مالکہ مس میکنیل کے پاس ان کا ڈرائیونگ لائسنس ہو۔"

شہزاد نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے کار سے نکل گیا۔

"کرسٹین! تم کار چلاؤ۔"

کرسٹین پہلے تو بت بنی بیٹھی رہی۔۔۔۔ پھر خاموشی کے ساتھ اُٹھی اور ڈرائیور کی سیٹ پر آ گئی۔

"اور مسٹر ملک! یہ آپ کا عدالت میں حاضری کا نوٹس ہے!"

پولیس افسر تو جلدی سے گاڑی لیکر چلا گیا لیکن کرسٹین کو ہوش سنبھالنے میں کافی دیر لگی۔

"چلو چلیں۔۔۔۔ مجھے خبر نہ تھی کہ میرا لائسنس ختم ہو چکا ہے۔"

کرسٹین اس کی اس بے اعتنائی سے اور بھی حیران و ششدر تھی، اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔

دونوں نیاگرہ فال کے پاس چہل قدمی کرتے کرتے رک گئے۔ فال ان کے سامنے تھا اور وہ پانی کی پھوار سے بھیگ رہے تھے۔

"میں تو جب بھی غمزدہ یا خوش ہوتا ہوں اس طرف چلا آتا ہوں، کبھی تو یہ فال مجھے زندگی کی امید دلاتا ہے اور کبھی موت کا پیغام دیتا ہے!"

"آج کیا عالم ہے۔؟"

"جی چاہتا ہے کہ ان لہروں کو گلے سے لگا کر سو جاؤں اور پھر کبھی نہ اٹھوں۔ میری زندگی کا مقصد مفقود ہوتا جا رہا ہے۔" پھر اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد غیر متوقع سا سوال کیا۔

"کرسٹین! کیا تمہاری زندگی کا کوئی مقصد ہے۔؟"

"ہاں، خوشی کی تلاش!"

"لیکن اس دنیا میں تو صرف وہی شخص خوش رہ سکتا ہے جو اپنی ذات اور ماحول کے سب دکھوں سے بے حس ہو جائے۔ بے حسی اور خوشی کا چولی دامن کا ساتھ ہے!"

"شہزاد! میرے کپڑے بھیگ رہے ہیں، چلو ایسی جگہ چل کر بیٹھیں جہاں تنہائی بھی ہو اور ہم فال کا منظر بھی دیکھ سکیں۔"

"چلو! مجھے بھی تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

وہ دونوں چلتے چلتے ایک گھنے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔

"کرسٹین! میں تم سے کچھ باتیں صاف صاف کرنا چاہتا ہوں!"

کہو!"

"میں نہ تو سوشل ورکر ہوں اور نہ مسی ساگا میں رہتا ہوں، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔۔۔ اس کے علاوہ بھی میری زندگی میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو شاید تمہیں پسند نہ ہوں، میں چور بھی ہوں، جواری بھی۔۔۔ شرابی بھی ہوں، زانی بھی۔۔۔ پولیس میں میرا ریکارڈ بہت خراب ہے۔۔۔ میں کافی عرصے سے کوکین اور ایمفیٹامین کے کاروبار میں ملوث ہوں، خود بھی استعمال کرتا ہوں، میں نے آج صبح بھی ایک انجکشن لگایا تھا۔۔۔ میں زندگی سے تنگ آچکا ہوں، ساری زندگی ایک ڈرامہ ہے، میرے خیال میں میرے رول کے خاتمے کا وقت آگیا ہے۔۔۔ تم مجھ پر مہربان تھیں، اس لئے سوچا کہ تم سے صاف صاف کہدوں، میں بہت DEPRESSED ہوں!"

کرسٹین وہاں پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔

کس بات کا یقین کروں اور کس بات کو نظر انداز کردوں۔ "کیا یہ ذمہ دار سوشل ورکر ہے یا عادی مجرم۔" "کیا یہ حقیقت بیان کر رہا ہے یا میرا امتحان لے رہا ہے۔" "کیا وہ اس کے آگے دوستی اور ہمدردی کا ہاتھ بڑھائے یا میلوں دور بھاگ جائے۔۔۔" وہ عجب شش و پنج میں تھی۔

"لیکن تم نے یہ جرائم پیشہ زندگی اختیار کیسے کی۔" اس کے اندر کا سوشل ورکر جاگ رہا تھا۔

"میں کیا جانوں۔۔۔ میں تو ایسے ماحول میں پیدا ہوا جہاں مذہب، منافقت اور جابرانہ حکومتوں کے سائے ہر وقت سروں پر لہراتے رہتے ہیں اور خدا دور کہیں بیٹھا مسکراتا رہتا ہے اور جب بھی خدا یا حکومت عوام کے حقوق کا تحفظ نہ کرے تو لوگ قانون اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں، اور جب سے میں کینیڈا آیا ہوں میرا حال دھوبی کے کتے کا ہے نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

کرسٹین کو اچانک احساس ہوا کہ وہ شخص جس کا وہ انٹرویو لینا چاہ رہی تھی اس کا مریض نہ تھا، محبوب تھا۔ وہ ایکدم کھڑی ہوگئی۔

"تم دھوکے باز ہو اور اپنی باتوں کے جال میں مجھے پھنسانا چاہتے ہو۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔"

"یہ بھی تمہارا ہتھکنڈا ہے۔۔۔ تم مجھے جھوٹ سچ کی کھٹی میٹھی گولیاں کھلا کر اپنی خوابگاہ میں لے گئے اور اپنی شرافت کا ڈھونگ رچاتے رہے، اب میں تمہیں سمجھ گئی ہوں، تم کریمنل CRIMINAL ہو کریمنل۔۔۔ تمہیں شہری گلیوں میں نہیں جیل کی کوٹھری میں ہونا چاہئے تم نہ جانے کتنے معصوم لوگوں کی زندگیاں تباہ کرچکے ہو۔۔۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔۔۔ نفرت۔۔۔"

اس کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئی تھیں۔

"میں نے تم پر اعتماد کیا اور تم نے اس کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔۔۔ میں نے اپنی شادی اور اپنے خاوند کو بالائے طاق رکھ کر تمہیں اپنی محبت دینی چاہی اور تم نے اس کا مذاق اڑایا۔۔۔ میں تم جیسے ذلیل آدمی کے ساتھ ایک لمحہ بھی مزید نہیں گزارنا چاہتی۔۔۔ جاؤ نیاگرا فال میں کود جاؤ۔۔۔ خس کم جہاں پاک۔"

کرسٹین تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے جانے لگی۔

"بات تو سنو۔۔۔ بات تو سنو۔۔۔ غصہ تھوک دو۔۔۔ مجھے گھر تو چھوڑ آؤ۔"

کرسٹین نے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور شہزاد خلاؤں میں گھورتا رہ گیا۔

وہ ہچ ہائک HITCH HIKE کرتا ہوا گھر پہنچا تھا۔

اور اس رات اس کی ماں نے اسے خون میں لت پت پایا تھا۔۔۔

مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی

اُسے ہسپتال میں پورا ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ اس ایک مہینے میں اسے بہت سے دلچسپ واقعات پیش آئے تھے لیکن وہ جس مقصد کے لئے وہاں آیا تھا وہ ہنوز تشنۂ تکمیل تھا — اس کا خیال تھا کہ ماہرینِ نفسیات اس کی روح کے زخموں پر مرہم رکھ دیں گے اور وہ ایک دن خوش خوش گھر چلا جائے گا لیکن وہ ان نرسوں، سوشل ورکرز، سائیکالوجسٹ اور ڈاکٹروں سے زیادہ متاثر نہ ہوا تھا۔

اگر جیولی وہاں نہ ہوتی تو وہ کب کا جا چکا ہوتا۔

اس نے ساتھ والے بستر کو دیکھا، کیتھی جو ایک عمر رسیدہ عورت تھی اپنے بستر پر پہلو بدل رہی تھی، اس کے بستر کے پاس ہی اس کی ویل چیئر پڑی ہوئی تھی جو اس کا واحد سہارا تھی۔ کیتھی ہمیشہ ملول و غمگین رہتی تھی، اسے انگلستان سے کینیڈا ہجرت کئے بیس برس ہو گئے تھے لیکن جوں جوں بڑھاپا دبے قدموں اس کی زندگی میں داخل ہو رہا تھا وہ زیادہ دل برداشتہ ہو رہی تھی — پچھلے ہفتے اس کی پچھترویں سالگرہ تھی اور وہ اکیلی تھی، نہ کوئی مونس نہ غمخوار، وہ ساری رات روتی رہی، صبح چار بجے ایمبولنس کو فون کیا اور ہسپتال چلی آئی ڈاکٹر نے اسے سائیکاٹری PSYCHIARTRY

کے وارڈ میں داخل کر دیا۔ چوں کہ اور کسی کمرے میں جگہ نہ تھی اسے شہزاد کے کمرے میں ڈال دیا گیا۔ شہزاد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی ایسے مسئلے کے لئے ایمبولنس کو بلائے گا۔

شہزاد کے ذہن میں نفسیاتی مسائل، ان کی نوعیت اور ان کے علاج کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ اس کی معلومات ڈائجسٹوں کے مضامین تک محدود تھیں۔ وہ تو ایسی جگہ پلا بڑھا تھا، جہاں لوگ ملیریا، اسہال اور ٹی بی سے مرتے ہیں اور جہاں ہر لمحہ زندگی اور موت کا مسئلہ کھڑا رہتا ہو وہاں نفسیاتی الجھنوں کی طرف کون توجہ دیتا ہے۔ اس لئے جب زیچل نے کئی دفعہ اور سلیم نے بھی ایک دفعہ اسے ماہر نفسیات سے ملنے کا مشورہ دیا اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ پہلے تو وہ ناراض ہو جاتا بلکہ غصہ آ جاتا اور میں پاگل نہیں ہوں کہہ کر بات کا رخ موڑ دیتا لیکن بعد میں وہ خاموش رہتا۔

جب اقدام خودکشی کے بعد دو دفعہ وہ ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ EMERGENCY DEPARTMENT اور انٹینسو کیئر یونٹ INTENSIVE CARE UNIT میں رہا اور اس کی طبیعت بحال ہونے کے بعد نرسوں نے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیا تو وہ گھر بھاگ گیا تھا۔ اور نرسوں نے یہ سوچتے ہوئے "آپ گھوڑے کو دریا تک تو لے جا سکتے ہیں لیکن زبردستی پانی نہیں پلا سکتے۔" اسے جانے دیا تھا۔

لیکن ایک رات وہ خود ہی ماہر نفسیات سے ملنے چلا آیا تھا۔

اس شام وہ زیچل کی مزاج پرسی کرنے گیا تھا کیوں کہ زیچل کو نزلہ، زکام، کھانسی اور سردی لگنے کی شکایت تھی لیکن وہ یہ دیکھ کر خوش ہوا کہ اس کا بیٹا ڈیوڈ ماں سے ملنے آیا تھا۔ وہ شہزاد کو دیکھتے ہی "انکل" کہہ کر لپٹ گیا۔ شہزاد کو بچوں سے بہت انس تھا۔ زیچل کبھی کبھار اسے ڈیوڈ سے کھیلتا دیکھتی تو کہتی۔

"شہزاد! تمہارے ہاں بچہ ہوگا تو زندگی میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوگی۔" اور وہ مسکراتا ہوا ڈیوڈ کے ساتھ کھیلتا رہتا۔

اس شام ڈیوڈ اس بات سے افسردہ تھا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور اسے سیر کے لئے نہیں لے جا سکتی۔

"ڈیوڈ! کیا کرنا چاہتے ہو؟" شہزاد نے پیار سے پوچھا تھا۔

"انکل! میکڈانلڈ کا بگ میک BIGMAC کھانا ہے!"

"ممی سے اجازت لے لو۔"

ممی کو بھلا کب انکار تھا اور وہ بھی شہزاد کے ساتھ بلکہ اسے خوشی تھی کہ ڈیوڈ کسی مرد کے ساتھ کچھ وقت گزارے گا تو اس کے سامنے رول ماڈل ROLE MODEL رہے گا۔ سنگل مدرز SINGLE MOTHERS کو اپنے بچوں کی تربیت کے لئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

شہزاد اور ڈیوڈ بگ میک، فرنچ فرائز اور کوک سے لطف اندوز ہوئے۔ شہزاد زیچل کے لئے بھی کوک خریدنا چاہتا تھا لیکن ڈیوڈ نے "ممی کو زکام ہے" کہہ کر اسے منع کر دیا۔

کھانے کے بعد وہ قریب ہی ایک کھلونوں کی دکان TOYSRUS میں گھس گئے وہ سٹور سٹفیڈ اینیملز STEIFFED ANIMALS سے بھرا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کی اچھل کود کے بعد ڈیوڈ بھاگا بھاگا آیا اور بڑی ملتجیانہ نظروں سے کہنے لگا۔

"انکل! مجھے ایک ٹیڈی بیر TEDDY BEAR چاہئے۔ میرے سب دوستوں کے پاس ہے لیکن میرے پاس نہیں ہے!"

اس سے پہلے ڈیوڈ نے کبھی ایسی فرمائش نہ کی تھی۔ شہزاد کو بھی اندازہ تھا کہ اس نے ڈیوڈ کو اس کی سالگرہ پر کوئی تحفہ نہ دیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی جیب میں چند سکوں کے علاوہ کچھ نہ بچا تھا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سر کھجاتا رہا، پھر اچانک اس کی نگاہ اپنی کلائی کی گھڑی پر پڑی اور نظروں میں چمک پیدا ہوئی۔

"ڈیوڈ! چلو ذرا سیر کر آئیں، پھر آ کر ٹیڈی بیر خریدیں گے۔" ڈیوڈ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ساتھ چل دیا۔

شہزاد نے چار سو ڈالر کی گھڑی سو ڈالر میں بیچ دی اور واپس آ کر اسے ایک بڑا سفید رنگ کا ٹیڈی بیر اسی ڈالر میں خرید کر دیا۔ ڈیوڈ نے خوشی سے پہلے ٹیڈی بیر کو اور پھر شہزاد کو گلے سے لگایا اور رخسار پر شکریے کا بوسہ دیا۔

واپس آکر اس نے زیبل کو بتایا کہ وہ ڈیوڈ کا سالگرہ کا تحفہ تھا۔

شہزاد نے اس شام گھر میں قدم رکھا تو اسے یُوں لگا جیسے کسی نے گرم توے پر پانی کے قطرے چھڑک دیئے ہوں۔ اس کی ماں اور ابّو دونوں غصّے میں بھرے بیٹھے تھے، ماں نے اسے وہ نوٹس دیا جس کے تحت اسے عدالت میں حاضر ہونا تھا اور جیسیوں الزامات کو بھگتنا تھا اور باپ نے اسے اَن ایمپلائمنٹ سینٹر UNEMPLOYMENT CENTRE کا خط دیا جس میں اسے ملازمت کے لئے انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔

"تم انٹرویو دینے کیوں نہیں جاتے۔" ہر لفظ سے غصّہ ٹپک رہا تھا۔ شہزاد جانتا تھا کہ ایک زمانہ تھا جب اس کا باپ ایسے سوالوں سے بے نیاز تھا، لیکن اس کے چچا نے اس کے باپ کو اتنا بھڑکایا تھا کہ اب وہ بھی سرزنش کرنے لگے تھے۔

"میں پانچ ڈالر فی گھنٹہ کی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"حلال کی کمائی میں عار ہی کیا ہے۔ انسان کو محنت مزدوری پہ فخر کرنا چاہئے۔"

اس نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی۔

اتنے میں اس کی ماں کی نگاہ اس کی کلائی پر پڑی۔

"تمھاری گھڑی کہاں ہے؟"

پہلے تو اس نے سوچا کہ جھوٹ بولے، لیکن پھر سچ کہنے کے سارے فوائد اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔

"میں نے بیچ دی ہے!"

"وہ تو تمھارے چچا جان نے تحفتہً دی تھی۔"

"اسی لئے تو میں نے اس خبیث کی گھڑی بیچ دی۔" اس کے اندر لاوا پھر سُلگنے لگا تھا۔

"وہ میرا بھائی ہے احترام سے بات کرو۔"

"آپ کا ہوگا۔ میری زندگی میں اس کا کوئی دخل نہیں۔" اور اس سے پہلے کہ لاوا

پھٹ جاتا وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور نیند کی آغوش میں پناہ تلاش کرنے لگا۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ پسینے میں شرابور تھا۔ صبح کے دو بج رہے تھے، اس نے عجب ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ بستر سے اٹھا، کوٹ اور جوتے پہنے اور گھر سے نکل گیا۔ وہ بہت دیر تک چلتا رہا، جب رُکا تو اس نے اپنے آپ کو ہسپتال کے سامنے پایا۔

"تمھیں کسی ماہرِ نفسیات سے مشورہ کرنا چاہئیے۔" اسے زیبل کی بات یاد آئی اور وہ ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں چلا گیا۔

"میں ذہنی طور پر بہت پریشان ہوں، مجھے کسی ماہرِ نفسیات سے بات کرنی ہے!"

نرس نے دیوار پر لٹکے ایک چارٹ پر دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ماہرِ نفسیات تو رات کو کام نہیں کرتے لیکن ان کی اسسٹنٹ ایک انٹرن ڈاکٹر جیولی آرنلڈ ڈیوٹی پر ہیں، آپ ویٹنگ رُوم میں انتظار کریں، میں انھیں بلاتی ہوں!"

شہزاد انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد لمبے قد، لمبے بالوں اور سفید لمبے کوٹ میں ملبوس ڈاکٹر آنکھیں ملتے ہُوئے کمرے میں داخل ہُوئی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں نیند کے کنول نمایاں تھے۔ وہ اسے انٹرویو رُوم میں لے گئی۔

"میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں ہمدردی کے دیئے ٹمٹما رہے تھے۔

"میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، جس نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔" وہ اپنی پریشانی کے باوجود اس کے سراپے سے مسحور ہو رہا تھا۔

"وہ کیا خواب تھا؟"

"میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مر چکا ہُوں، میری لاش کمرے میں پڑی ہے، سب دوست، رشتہ دار اردگرد کھڑے ہیں اور پھول پھینک رہے ہیں۔

میری ماں کہتی ہیں۔ "بے چارا بہت بیمار تھا۔"

"ابّا جان کہتے ہیں۔ "بہت سست اور کاہل تھا۔"

اتنے میں میرے چچا آتے ہیں اور غصے میں کہتے ہیں۔

"بے وقوف، نااہل۔ اس نے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی۔ چلو جلدی کرو، اسے دفنا کر فارغ ہو جائیں۔" اور میں یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں، کہنا چاہتا ہوں "میں زندہ ہوں، سب کچھ سُن رہا ہوں لیکن نہ ہل سکتا ہوں اور نہ بات کر سکتا ہوں۔"

سب لوگ میری لاش کو قبرستان میں لے جاتے ہیں۔ میں چیخنا چلانا چاہتا ہوں لیکن سب بے سود۔

"مجھے زندہ درگور نہ کرو——" میں احتجاج کرنا چاہتا ہوں، اتنے میں وہ مجھے قبر میں اُتار دیتے ہیں اور مٹی ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے والدہ کے رونے اور بین کرنے کی آواز آتی ہے اور پھر چچا کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔

"خس کم جہاں پاک۔"

وہ سرگوشی تازیانے کا کام کرتی ہے اور میں اسی عالمِ وحشت میں جاگ جاتا ہوں، میں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور اور خون کی چادر میں لپٹا ہوا پاتا ہوں—— پہلے تو میں اپنے چچا کو چند گالیاں دیتا ہوں اور پھر مجھے اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

شہزاد نے اپنی آستین اُوپر کر کے بازو پر چاقو کے بے شمار نشان دکھاتے ہوئے کہا۔ "سوچا کام ختم کر دوں لیکن پھر ہسپتال چلا آیا۔ اگر مجھے مدد نہ ملی تو میں دماغ کھو بیٹھوں گا۔"

جیولی اس کی صاف گوئی اور غم سے بہت متاثر ہوئی۔

"تم بہت دکھی انسان لگتے ہو، وارڈ میں صرف ایک بستر بچا ہے میں تمہیں داخل کر لوں گی۔"

شہزاد پہلے کبھی کسی سائیکاٹرک وارڈ میں داخل نہ ہوا تھا بلکہ سوائے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں چند گھنٹے گزارنے کے کبھی کسی بھی ہسپتال کے کسی بھی وارڈ میں نہ رہا تھا۔ پہلے دو دن تو وہ یونٹ کی ساخت سے ہی متاثر ہوتا رہا۔ وہ ہسپتال نیا نیا بنا تھا۔ نیا قیمتی کارپٹ، رنگین وال پیپر، پلاسٹک اور لکڑی کی آرام دہ کرسیاں، ہر کمرے میں آئینہ اور ٹی وی اور ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم—— شروع میں اسے احساس ہوا کہ وہ ہسپتال میں نہیں، ہالی ڈے ان HOLLIDAY INN میں ہے۔

وہ یونٹ کی جسمانی ساخت سے جتنا متاثر تھا یونٹ کے اسٹاف سے اتنا ہی مایوس ہوا تھا۔ وہ کسی آرمی کا یونٹ لگتا تھا، سائیکاٹرسٹ اس کے کرنل، ہیڈ نرس اس کی میجر اور باقی نرسیں کپتان۔ ہیڈ نرس ایک تنومند بھاری بھرکم ڈکٹیٹر تھی جس نے یونٹ کے ہر کام کے لئے قوانین بنا رکھے تھے۔ اور اگر کوئی ان قوانین میں ذرا بھی کوتاہی کرتا تو وہ اس کا کورٹ مارشل کر دیتی، چونکہ اس یونٹ میں چار سائیکاٹرسٹ تھے اس لئے وہ سب ہیڈ نرس پر اعتبار کرتے تھے، اور حقیقت اس کے اختیارات میجر ہونے کے باوجود ایک لحاظ سے کرنلوں سے

rekhta

زیادہ تھے۔

پہلے ہی دن اسے ایک خاص منظر نظر آیا تھا۔ ایک مریض جون سے جس نے کئی دنوں سے کھانا پینا بند کر رکھا تھا، ہیڈ نرس نے پوچھا۔

"تم کھانا کیوں نہیں کھاتے؟"

"مجھے خدا نے منع کر دیا ہے، مجھے ہر صبح آسمان سے اس کی آواز آتی ہے!"

"سنو جون! اس وارڈ کی خدا میں ہوں اور میرا حکم ہے کہ تم کھانا کھایا کرو۔"

حیرانگی کی بات یہ تھی کہ اس مریض نے کھانا کھانا شروع کر دیا تھا۔

شہزاد کو ایک انسان کا دوسرے انسان کو حکم دینا زیادہ پسند نہ تھا، اسی لئے اس کی اپنے خاندان والوں سے نہ بنتی تھی، وہ جتنے احکام دیتے وہ اتنا ہی حکم عدولی اور بغاوت پر آمادہ ہوتا۔

اس یونٹ میں کُل بیس مریض تھے، کچھ مرد اور کچھ عورتیں۔ بعض کمرے میں صرف ایک مریض تھا اور بعض میں دو دو۔ یونٹ کے درمیان میں نرسوں کا اسٹیشن تھا، ایک طرف ڈائننگ رُوم، اور دوسری طرف لاؤنج جہاں مریض بیٹھ کر گپ شپ لگاتے، تاش کھیلتے، اور اونگھتے رہتے۔

شہزاد کا خیال تھا کہ ماہر نفسیات ہر روز اس سے ملے گا، گھنٹے گھنٹے کا انٹرویو ہوگا، لیکن پہلے تین دن تو اسے ماہر نفسیات کی شکل تک دیکھنا نصیب نہ ہوئی، پھر چند لمحوں کی ملاقات پر اکتفا کیا جاتا۔ وہ حیران تھا، اس کا واسطہ زیادہ تر نرسوں کے ساتھ پڑتا، جو یونٹ کو چلانے اور اس کی انتظامی کارروائیوں میں زیادہ دلچسپی رکھتی تھیں اور مریضوں کے مسائل پر غور کم کرتی تھیں۔ قوانین کی پابندی اس ماحول کی سب سے بڑی قدر تھی۔

نرسوں کے ساتھ اس کی چپقلش شروع ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

جیولی اس سے ہر صبح دس بجے ملنے آتی اور آدھے گھنٹے تک گفتگو کرتی رہتی۔ جیولی نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ ماہر نفسیات نہیں اور وہاں صرف چھ ہفتوں کے لئے ہے۔ لیکن پھر بھی وہ شہزاد کو پسند تھی۔ وہ اس یونٹ میں اس کا واحد سہارا تھی۔ وہ واحد عورت

تھی جو اس سے مریضوں کی طرح نہیں انسانوں کی طرح پیش آتی تھی۔ نرسوں کو جیولی ذرا نہ بھاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شہزاد کو سر پر چڑھا رہی ہے۔

ایک دن شہزاد سو رہا تھا کہ اس کی اماں آئیں، پہلے وہ گوشت اس کے سر پر وارتی رہیں۔ نرس نے پوچھا کہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ تو کہنے لگیں۔

"یہ ردِ بلا ہے، میں غریبوں میں تقسیم کروں گی تاکہ اس کے سر سے مصیبتیں ٹل جائیں۔!"

نرس خاموش رہی۔ وہ جاگا تو اسے پتہ چلا کہ والدہ اس کے لئے حلوا اور دیوانِ غالب چھوڑ گئی ہیں۔ وہ اپنی ماں کی ممتا کے بارے میں سوچ کر مسکرا دیا۔ "وہ سادہ ہی لیکن میرا خیال بہت رکھتی ہیں۔"

اس سہ پہر وہ لاؤنج میں بیٹھا تھا کہ اس یونٹ کی تین نوجوان مریضائیں بھی آ گئیں۔ اس نے اپنی والدہ کی ملاقات اور حلوے کا ذکر کیا تو انھوں نے حلوہ چکھنے کی فرمائش کی، شہزاد بھاگا بھاگا گیا اور حلوہ اٹھا لایا۔ ان عورتوں نے حلوہ پہلے کبھی نہ چکھا تھا۔ اگرچہ وہ تینوں ڈائٹ DIET پر تھیں پھر بھی وہ انگلیاں چاٹتی رہ گئیں۔

اس شام شہزاد کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ وہ غم و اندوہ کی گہرائیوں میں اُتر گیا، اور سوچنے لگا۔ "میری اس دنیا میں حیثیت ہی کیا ہے، زمین پر رینگتا ہوا کیڑا ہوں۔ اس کائنات میں لاکھوں گلیکسیز GALAXIES ہیں، سُورج ہیں، زمین ہیں، چاند ہیں ان میں سے ایک زمین پر میں پانچ ارب لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں۔" اسے وہ منظر یاد آیا جب وہ ہوائی جہاز میں نیویارک کے اوپر سے اُڑا تھا اور اسے لاکھوں لوگ حشرات الارض کی طرح نظر آ رہے تھے۔ "ہم پیدا ہوتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔"

وہ بجلی بجھائے کمرے میں لیٹا تھا کہ ڈاکٹر سمتھ، جیولی اور نرس داخل ہوئے۔

"شہزاد کیا حال ہے۔؟ اندھیرے میں کیوں لیٹے ہو۔؟"

"زندہ درگور ہوں!"

"کیوں ــــ زندگی سے کوئی اُنس نہیں۔؟"

"زندگی تو جہنم کا دوسرا نام ہے، بہتر ہو جائے تو برزخ بن جاتی ہے!"

"اچھا پھر بات ہوگی!" یہ کہہ کر ڈاکٹر سمتھ چلے گئے۔

رات کو وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا، نرسوں کے اسٹیشن کے پاس سے گزرا تو اسے گفتگو سنائی دی۔

"اپنے آپ کو راجا اندر سمجھتا ہے!"

"اس کی ماں بہت جاہل اور توہم پرست ہے، اسے سر پہ اٹھا رکھا ہے۔"

"جولی بھی اس کے نخرے سہتی ہے!"

اتنے میں اسے انچارج نرس سنتھیا کی آواز آئی جسے شہزاد سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

"باقی مریضوں کو اس نے آگے لگا رکھا ہے، شام کو تین عورتیں لڑ رہی تھیں کہ اس کی قمیص کو بٹن کون لگائے، اس نے تینوں کو حلوا کھلایا تھا۔"

شہزاد سوچنے لگا کہ سنتھیا جو خود ایک خوب صورت عورت تھی اور ایک پولیس افسر کی بیوی تھی کہیں حسد کا شکار نہ ہو۔

اگلے دن ہفتہ وار کانفرنس ہوئی۔

جولی نے کیس پیش کیا۔ "شہزاد ملک ایک پاکستانی جوان ہے جو دس سال سے کینیڈا میں مقیم ہے لیکن بہت پریشان حال اور افسردہ ہے، داخل ہونے سے پہلے وہ ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا جن میں وہ قبر میں لیٹا رہتا اور اس کے خاندان والے فقرے کستے رہتے، وہ دو یا تین دفعہ پہلے اقدام خودکشی کر چکا ہے۔"

اس سہ پہر کو اس کی نرس نے اسے بتایا کہ کانفرنس کے بعد ڈاکٹر سمتھ نے اسے گولیوں پر ڈالا تھا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ وہ DEPRESSION کا شکار ہے انھوں نے ایک سائیکالوجسٹ اور ایک سوشل ورکر سے بھی درخواست کی تھی کہ اس کا انٹرویو لے کر اپنے مشوروں سے آگاہ کریں۔

"لیکن ڈاکٹر سمتھ نے مجھے دوائیوں پر ڈالنے سے پہلے مشورہ تو نہیں کیا۔"

"یہ ان کا حکم ہے!"

شہزاد سمجھ گیا کہ وہاں سب احکام دینے اور لینے کے عادی ہو گئے ہیں، کسی سے مشورہ

کرنا بھول گئے ہیں۔

جولی بدستور اس سے روز ملنے آتی، شہزاد کو وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھی، اگر وہ ہسپتال نہ ہوتا تو وہ اس کی نیلی آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ــــ اس کے ساتھ ساتھ جولی، اور نرسوں میں اور خاص طور پر سنتھیا کے ساتھ کشیدگی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک شام تو حالات حد سے تجاوز کر گئے۔ شہزاد اپنے کمرے کی رفیق کیتھی سے مصروف گفتگو تھا۔ کیتھی جو بہت خاموش طبع تھی اور چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی تھی۔ شروع میں شہزاد سے زیادہ ہمکلام نہ ہوتی لیکن اس شام اسے غسلخانے جانا تھا لیکن اس کی وہیل چیئر کام نہیں کر رہی تھی۔ اس نے نرس کو بلایا لیکن نرس یہ کہہ کر "میں ابھی مصروف ہوں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" چلی گئی۔ کیتھی کو واش روم جانا تھا۔ شہزاد نے اٹھ کر وہیل چیئر کا معائنہ کیا اور اسے اندازہ ہوا کہ اس کے پہیے کا ایک پیچ ڈھیلا تھا، اس نے پیچ کش سے اسے ٹھیک کر دیا۔ کیتھی اسے دعائیں دیتی ہوئی واش روم چلی گئی۔

چند منٹوں کے بعد سنتھیا غصے میں بھاگی بھاگی کمرے میں آئی۔

"شہزاد ملک کیا تمھارے پاس اسکریو ڈرائیور SCREW DRIVER ہے؟"

"ہاں ہے! میں نے ابھی کیتھی کی وہیل چیئر درست کی ہے!"

"وہ ایک ویپن WEAPON ہے اور اس کی یونٹ میں اجازت نہیں۔ تمھیں آتے ہی نرسوں کے حوالے کر دینا چاہیے تھا ــــ!" وہ غصے میں بولے چلی جا رہی تھی۔

"تم اگر چاہو تو اسے لے لو، مجھے یونٹ کے قوانین کی کیا خبر۔"

"تمھیں خبر ہونی چاہیے۔" کہتے ہوئے اس نے اسکریو ڈرائیور SCREW DRIVER چھین لیا۔

شہزاد کا جی تو چاہا کہ اس کے منہ پر طمانچے مارے اور کہے۔ "ایک تو کیتھی کی نرس نے مدد نہیں کی اور میں نے مدد کرنے کی کوشش کی تو بجائے شکریہ ادا کرنے کے ناراض ہو رہی ہو۔" لیکن پھر یہ سوچ کر کہ عورت ہے، کم عقل ہے، اگر مرد ہوتی تو دن کو تارے دکھا دیتا۔" منہ پھیر لیا۔

یُونٹ میں داخل ہو کر اس کے مسائل اور بڑھ گئے تھے، کم نہیں ہُوئے تھے ــــ سائیکالوجسٹ PSYCHOLOGIST نے انٹرویو لیا اور اسے سیکڑوں سوالوں کے فارم تھما دیئے جسے وہ بغیر سوچے سمجھے ہُوئے گھنٹوں پُر کرتا رہا ــــ سوشل ورکر آیا، اور اس کے خاندان کے بارے میں سوال پُوچھتا رہا ــــ سب سوال پُوچھ رہے تھے، جواب تلاش کرنے میں کوئی مدد نہیں کر رہا تھا۔

یُونٹ میں کشیدگی بڑھ رہی تھی، بعض جیولی کے حق میں تھے اور بعض سنتھیا کے، گویا ایک ہی مریض کی مدد کے لئے محاذ کھڑا ہو گیا تھا ــــ بعض کو شہزاد کی حالت پر رحم آتا، بعض کو غصّہ۔

اکثر مریض ویک اینڈز WEEKENDS کو گھر چلے جاتے ــــ ایک دفعہ شہزاد بھی جمعے کی شام کو گھر چلا گیا۔ اسے اتوار کی شام تک کی اجازت تھی، لیکن ہفتے کی رات کو گھر میں پھر ہنگامہ ہو گیا ــــ وہ کھانے کی میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا اور غالب کا شعر ؎

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

گنگنا رہا تھا کہ اس کے والد صاحب کمرے میں داخل ہُوئے اور اسے حکم دیا کہ وہ رشید چچا سے معافی مانگے کیوں کہ اس نے ان کی دی ہُوئی گھڑی بیچ کر بے عزتی کی تھی۔

"میں مر جاؤں گا لیکن ان سے معافی نہ مانگوں گا۔"

"تمھیں معافی مانگنی ہو گی ــــ!" اس کے باپ کے منھ میں غصّے سے تھوک بھر آیا تھا۔

"ہرگز نہیں!" وہ غصّے میں کھڑا ہو گیا اور کانپنے لگا ــــ وہ بڑھ کر باپ کو دھکا دینے لگا تھا کہ رُک گیا اور پھر اس نے کھڑکی پر گھونسہ مارا۔ اس کے ہاتھ سے خون اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اسے دوبارہ وقت سے پہلے ہی ہسپتال بھیج دیا گیا جہاں اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی باندھ دی گئی۔

رات بارہ بجے اس نے نرس سے جو اس رات اتفاقاً سنتھیا تھی، درخواست کی کہ وہ جیولی سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"بہت دیر ہو گئی ہے!" نرس نے کہا۔

"تو پھر کیا ہُوا ــــ؟ وہ میری ڈاکٹر ہے اور ڈیوٹی پر ہے!"

سنتھیا نے منھ بناتے ہُوئے فون کیا اور جیولی نے خندہ پیشانی سے "میں ابھی آتی ہوں" کہہ کر آنا قبول کر لیا۔

جیولی شہزاد کو دفتر میں لے گئی

"جیولی! میری حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے، میرے اندر کا غصّہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا، مجھے لگتا ہے میرے اندر کچھ ٹوٹ رہا ہے، ایک دن یا تو میں خود مر جاؤں گا یا چچا کو قتل کر دوں گا ــــ میں تمھیں بہت کچھ بتانا چاہتا ہوں، کیا تمھارے پاس سگریٹ ہے؟"

"نہیں ــــ! لیکن میں لے کر آتی ہوں!"

"جیولی نے سنتھیا سے سگریٹ مانگے تو اس نے انکار کر دیا۔ "یونٹ کی پالیسی ہے کہ رات گیارہ بجے کے بعد مریض سگریٹ نہیں پی سکتے۔" سنتھیا بولی۔

"لیکن شہزاد کی حالت بہت خراب ہے!"

"اس کی حالت تمھیں دیکھ کر خراب ہو جاتی ہے ــــ" اس کے لہجے میں طنز تھا ــــ "اگر سگریٹ چاہیئے تو سُپروائزر سے اجازت لو۔"

جیولی نے سُپروائزر کو فون کیا اور حالات بتائے۔

اگر بہت ہی ضروری ہے تو اس کے چارٹ پر آرڈر لکھ دیں، نرس آپ کو سگریٹ دے دے گی!" سپروائزر کی گفتگو میں بھی کاٹ تھی۔

جیولی نے بھی غصّے میں ایک کی جگہ تین سگریٹوں کا آرڈر لکھا۔

جیولی باہر گئی تو نرس نے جل بھُن کر کہا۔ "اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟"

یونٹ کی ہفتہ وار کانفرنس ایک جذباتی تھرمامیٹر کی طرح تھی، جسے دیکھ کر کوئی شخص بھی اس یونٹ کے آسٹان کے تعلقات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ چاہے وہ خوشی کی کیفیت ہو یا تلخی کی، اجتماعی مسرت ہو یا باہمی تضادات، سب اس کانفرنس کے آئینے میں نظر آجاتے۔

ایک بڑے کمرے میں پندرہ بیس کرسیاں دو دائروں میں بچھی رہتیں۔ ڈاکٹر سمتھ درمیان میں بیٹھتے اور نرسیں، سائیکالوجسٹ، سوشل ورکر اور دیگر رفقائے کار اس کے چاروں طرف، میڈیکل سٹوڈنٹ جو اس یونٹ میں ٹریننگ حاصل کر رہے تھے دوسری قطار میں بیٹھتے۔ اس یونٹ میں ان سٹوڈنٹس کے راؤنڈز ROUNDS کے تصور کو دھچکا لگتا، سرجیکل یا میڈیکل یونٹ میں وہ پروفیسر کے ساتھ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑتے جاتے لیکن اس یونٹ میں کرسیوں پر بیٹھ کر راؤنڈز ہوتے جو ان کو حیران کرنے کے لئے کافی تھے۔

اس دن بھی جب سب لوگ بیٹھ گئے تو ڈاکٹر سمتھ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"خواتین و حضرات! شہزاد ملک کو اس وارڈ میں چار ہفتے ہو گئے ہیں لیکن حالات زیادہ نہیں بدلے، میں نے اسے ANTI DEPRESSENTS کی گولیاں دیں لیکن اس سے اس کی

DEPRESSION پر کچھ اثر نہ ہوا۔"

پھر اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی بوڑھے سے قد کی سائیکالوجسٹ روزمیری کی رائے پوچھی تو وہ کہنے لگی۔

"میں نے اسے INDIVIDUAL اور GROUP THERAPY میں INVOLVE کرنا چاہا لیکن وہ اتنا غصے میں بھرا ہوا ہے کہ حاضری نہیں دیتا۔ ملتا ہے تو کہتا ہے کہ جیولی کی موجودگی میں کسی اور THERAPIST کی ضرورت نہیں۔"

سب نرسوں نے ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا اور پھر جیولی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

روزمیری نے اپنی رائے کے اختتام پر کہا۔

"بھینس کے آگے بین بجانے سے کیا فائدہ!"

ڈاکٹر سمتھ نے لمبے تڑنگے سوشل ورکر رچرڈ کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

"اس کا خاندان بہت غیر معمولی ہے اور توہم پرستی سے پُر۔ اس خاندان کے BELIEFS جن میں سے بہت سے CULTURAL ہیں کچھ اتنے FIXED ہیں کہ ان کو بدلنے کے لئے برسوں کی THERAPY کی ضرورت ہے۔ اس کی ماں اس سے محبت کرتی ہے لیکن بیوقوف دوست کی طرح۔ ایک دن میں اس کی ماں سے ملنے گیا تو گھر میں سفید چادر بچھا کر تقریباً پچاس عورتیں بیٹھی تھیں، پتہ چلا کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت اور سوا لاکھ کا ختم کر رہی تھیں تاکہ عدالت میں جج کا دل موم ہو جائے۔ اور جب شہزاد عدالت میں گیا تو اس کی ماں نے پانچ ہزار ڈالر کی ضمانت دے کر اسے جیل جانے سے بچایا۔

ایک نرس کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے اس کا مسئلہ منشیات کا ہے ہمیں اسے ALCOHOL AND DRUGS CENTRE بھیجنا چاہیئے۔"

جب ڈاکٹر سمتھ نے جیولی کی رائے پوچھی تو نرسوں نے ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے دیکھا ــــ وہ پہلو بدل کر بیٹھی، گلا صاف کیا اور پھر کہنے لگی۔

"اگر میں دل کی بات کہوں تو میں بہت مایوس ہوئی ہوں، میرا سائیکاٹرک یونٹ کا

یہ تصور نہیں تھا۔

کوئی کہتا ہے مسئلہ BIOLOGICAL ہے، دوائیوں سے علاج ضروری ہے۔

کوئی کہتا ہے PSYCHOLOGICAL ہے، گروپ تھیریپی ہونی چاہیئے۔

کوئی کہتا ہے مسئلہ خاندان کا ہے، فیملی تھیریپی کی ضرورت ہے۔

میں ماہرِ نفسیات نہیں ہوں لیکن میرے خیال میں مسئلہ انسانی ہے، انسانی دُکھ اور کرب کا ___ اور اس کا علاج انسانی ہمدردی سے ہونا چاہیئے، یہاں تو سگرٹ تک حاصل کرنے کے لئے بیسیوں فون کرنے پڑتے ہیں، ہر قدم پر قانون اور پابندیاں ہیں، یہ ہسپتال کا یونٹ ہے یا آرمی کا یونٹ ___ یہاں جس قسم کی نرسنگ کیر NURSING CARE ملتی ہے میں اس سے بہت مایوس ہوئی ہوں، میں اپنے کسی دوست یا رشتہ دار کو کبھی یہاں نہیں بھیجوں گی۔"

ایک کونے میں بیٹھی نرس جو مین سے مزید برداشت نہ ہو سکا، کہنے لگی۔

"جیولی! تم یہاں چھ ہفتوں کے لئے آئی ہو اور میں یہاں چھ سال سے نرس ہوں، تم اس سے اتنی ہمدردی کرتی ہو کہ وہ سب نرسوں پر رعب جماتا ہے، سمجھتا ہے کہ وہ شہزادہ ہی نہیں بادشاہ ہے ___ میرے خیال میں وہ ذہنی مریض نہیں، عادی مجرم ہے، اگر وہ جیل میں دو چار ہفتے رہے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

کانفرنس روم کے جذباتی تھرما میٹر کا پارہ چڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر سمتھ نے چاروں طرف دیکھا وہ طلباء اور طالبات کے سامنے کچھ بھرم رکھنا چاہتے تھے، بولے۔ "وقت بہت کم ہے، ہم اگلے ہفتے اپنا آخری فیصلہ سُنائیں گے۔"

کانفرنس روم سے نکلتے ہوئے جو مین نے سرگوشی کی۔ "ڈاکٹر سمتھ! اس نے اسے اور بھی خراب کر دیا ہے۔"

وہ مسکرائے ___ "بچی ہے! سیکھ جائے گی!"

ایک رات شہزاد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کمرے میں سسکیوں کی آواز پھیل رہی تھی ___ اس نے بجلی جلائی تو دیکھا کہ کیتھی رو رہی ہے۔

"کیا بات ہے کیتھی۔؟" شہزاد نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"مجھے میری بیٹی یاد آ رہی ہے!"

"کہاں ہے تمھاری بیٹی۔؟"

"انگلینڈ میں!"

"فون کیوں نہیں کرتیں۔؟"

"بہت مہنگا ہے!"

"تو پھر کیا چاہتی ہو۔؟"

"خط لکھنا چاہتی ہوں لیکن لکھ نہیں سکتی!"

"کیوں نہیں۔؟"

"میری آنکھیں کمزور ہیں!"

"کیا میں مدد کروں۔؟"

"نہیں بیٹا۔۔۔ میں تمہیں ویسے بھی بہت ستاتی ہوں۔۔۔ تم میری بہت خدمت کرتے ہو۔۔۔ اگر میرے بچے تمہاری طرح سعادت مند ہوتے تو مجھے تنہائی کے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔"

شہزاد اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند اُڑ چکی تھی، اس نے کاغذ اور پنسل لیا اور کیتھی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا لکھوانا چاہتی ہو۔۔۔؟"

"بیٹا لکھو۔۔۔ یہ خط میری بیٹی مارگریٹ کے نام ہے!"

ڈیر مارگریٹ!

تم سے ملے ایک عرصہ گزر گیا۔ لگتا ہے ایک عمر بیت گئی۔ میں آج کل بہت بیمار ہوں، غمزدہ ہوں اور احساس تنہائی کا شکار ہوں! ہسپتال کے سائیکاٹرک وارڈ میں داخل ہوں!

بیٹی! ایک وہ زمانہ تھا جب میں اور تمہارا باپ بڑے شوق سے کینیڈا آئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ انگلینڈ کی نسبت ہم یہاں زیادہ خوش ہوں گے شروع میں تو یہ درست تھا، جب ہم مالی طور پر زیادہ آسودہ تھے لیکن آہستہ آہستہ کیفیت بدل گئی۔

جب سے تمہارا باپ فوت ہوا ہے میں بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں، ایسا لگتا ہے میں اکیلے رہنا بھول گئی ہوں، گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔۔۔ پہلے میرے پاس ایک کتا تھا لیکن پچھلے مہینے وہ بھی مر گیا اور اپنی پینسٹھویں سالگرہ پر تو قیامت گزر گئی۔ میں ساری رات روتی رہی اور اتنی DEPRESS ہوئی کہ ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

مارگریٹ!

اب میں یہاں اکیلی نہیں رہ سکتی، واپس اپنے گاؤں آنا چاہتی

ہوں، خدا کے لئے مجھے بلا لو ورنہ جیتے جی مر جاؤں گی۔

تمہاری والدہ۔۔۔ کیتھی

"شکریہ بیٹا!۔۔۔ کتنا اچھا ہو کہ تم لفافے پر ایڈریس بھی لکھ دو۔"

"کہاں ہے لفافہ۔؟"

اتنے میں ایک نرسنگ اسسٹنٹ داخل ہوتا ہے اور بڑی ناراضگی سے پوچھتا ہے۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟ رات کے تین بجے ہیں، بجلی بجھا دو۔"

"ہم خط لکھ رہے ہیں!" شہزاد نے نرمی سے کہا۔

"کیا یہ خط لکھنے کا وقت ہے۔" اس نے ڈانٹا۔

"خط لکھنے کا کوئی خاص وقت نہیں ہوتا!" شہزاد بھی اکھڑ گیا۔

"بجلی بجھاؤ اور بکواس بند کرو۔"

"تم حکم چلانا بند کرو۔" شہزاد اور بھی غصے میں تھا۔

اسسٹنٹ نے بڑھ کر بجلی بجھا دی۔۔۔ شہزاد نے بڑھ کر اسے ایک گھونسہ رسید کیا۔ "ذلیل کہیں کے۔"

پھر کیا تھا ایک طوفان آ گیا۔

شہزاد کو تین آدمیوں نے پکڑ کر باندھ دیا اور کولہے میں ایک ٹیکہ لگایا۔۔۔ وہ چلاتا رہا لیکن بے کار۔

ڈاکٹر صبح آئے فارم ون[۱] FORM 1 بھرا اور کہنے لگے۔

"شہزاد! تم سائیکاٹرک ہسپتال جا رہے ہو!"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں جانا چاہتا۔۔۔ میں پاگل نہیں ہوں!"

"یہ تو اب وہاں کے ڈاکٹر فیصلہ کریں گے۔"

"یہ میرے ہیومن رائٹس HUMAN RIGHTS کے خلاف ہے، میں تمہیں عدالت

---

[۱] فارم ون کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف پاگل خانے بھیجنے کا فارم۔

میں لے جاؤں گا۔"

ڈاکٹر مہتو نے اور کچھ نہ سنا اور اسے کاغذات سمیت، ہاتھ پاؤں باندھ کر دوسرے ہسپتال بھیج دیا۔

بنتی التجائیں کرتی رہی۔

"ایسا ظلم نہ کرو ــــ وہ میری مدد کر رہا تھا ــــ میرے لئے خط لکھ رہا تھا۔" لیکن اس کی بات کسی نے نہ سنی۔

شہزاد جب گھسٹتے ہوئے وارڈ سے جا رہا تھا تو نرسوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

rekhta

میری مسیحا جیولی!

مجھے کبھی کبھار ڈر لگتا ہے کہ تم میری مسیحائی کرتے کرتے کہیں خود ہی صلیب کی زینت بن جاؤ۔

مجھے اس پاگل خانے میں جسے جیل یا اصطبل کہنا شاید زیادہ مناسب ہو ہفتہ ہونے کو یا ہے۔ اگر تم مشورہ نہ دیتیں تو نہ جانے میں کب تک یہاں سسکتا رہتا، لیکن آج کی رات یری آخری رات ہے، چونکہ کل صبح نو بجے میری رہائی ہونے والی ہے اس لئے میں مجھے ن رہا ہوں اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے —— رات کے دو بج رہے ہیں اور میں مہیں خط لکھ رہا ہوں۔

میرا بستر جس ہال میں ہے وہاں بیس اور بستر بچھے ہیں اور ہم سب ایک ہی اصطبل ما کمرے میں رات بھر سونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اگر ایک پاگل ڈراؤنے خواب یکھ کر چیختا ہے تو دس اور جاگ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار یوں لگتا ہے کہ انسان سڑک پہ شا دیکھوں کو پرائیویسی PRIVACY بالکل نہیں ہے، نہ آپ ہنس سکتے ہیں، نہ رو سکتے ہیں

ہم سب کو ایک میز نما الماری ملی ہوئی ہے جس میں ہم ذاتی ضروریات کی چیزیں رکھ سکتے ہیں لیکن وہ مقفل نہیں ہو سکتی۔ کل شام ایک نوجوان مرد کی نرس سے لڑائی ہو گئی اور اس نے غصے میں آ کر سب مریضوں کی الماریاں الٹ دیں، بہت سی چیزیں ٹوٹ گئیں اور بہت سی چوری ہو گئیں۔

میں آج سہ پہر سیر کرتا ہوا پانی کے قریب جا پہنچا — جھیل کا کنارہ، سبز گھاس اور تازہ ہوا — چند دن کی جیل کی قید کے بعد ان مناظر سے دل کی امنگیں انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں اور چہرے پر مسکراہٹ کی دھوپ پھیل گئی — کئی دنوں کے بھوکے پیاسے کو سوکھی روٹی اور پانی کا گلاس بھی دعوت سے کم نہیں لگتا — میں پتھر اٹھا کر جھیل میں پھینکنے لگا، پتھر کے گرد پانی کی سطح پر لہریں بنتیں اور آہستہ آہستہ غائب ہو جاتیں، میں سوچنے لگا کہ کیا انسان بھی ان پتھروں کی طرح ہیں جو زیست کی جھیل میں لہریں پیدا کرتے ہیں اور پھر اس کی تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔

پچھلے چند دن اپنی تمام تر اذیتوں کے باوجود یادگار دن تھے۔ میں جھیل کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کو دیکھتا رہا اور ایک ایک دن کے واقعات اپنے تمام تر درد و کرب کے ساتھ مجھے یاد آتے رہے۔

پہلے دن جب میں اس پاگل خانے میں جاگا تھا تو میں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے کمرے کے فرش پر ایک میلے کچیلے بدبودار گدے پر لیٹے ہوئے پایا تھا۔ ایک جانگیے کے علاوہ میرے تن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔

دروازے میں ایک عجیب گول بلبلے کی شکل کی کھڑکی تھی، بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اسے اسی لئے BUBBLE ROOM کہتے ہیں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ نرس جو ڈیوٹی پر ہو وہ باہر سے ہی اس بلبلہ نما کھڑکی سے اندر جھانک کر اس خطرناک مریض کی حالتِ زار دیکھ سکے۔

اس کمرے میں نرسیں کھانے کی ٹرے بھی ایسے ڈر ڈر کر رکھتیں جیسے کسی چڑیا گھر میں کوئی شیر کے پنجرے میں کھانا رکھ رہا ہو —— شیر کو تو اپنے پنجرے میں پیشاب کرنے کی اجازت ہوتی ہو گی لیکن اس کوٹھری میں اس کی بھی اجازت نہ تھی۔

سارا دن گزرنے کے بعد ایک ڈاکٹر اور نرس کمرے میں آئے۔ میں کمرے کے ایک کونے

یں اکڑوں بیٹھا "میں کون ہوں ـــــ؟ کہاں ہوں ـــــ؟ اس دنیا میں کیوں پیدا ہوا ـــــ؟
نسان، انسانوں کا کیوں استحصال کرتے ہیں ـــــ؟" جیسے سوالوں پر غور و خوض کر رہا تھا ـــــ
"مسٹر ملک! اگر آپ کو کمرے سے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے تو آپ مریضوں یا نرسوں پر
حملہ تو نہیں کریں گے ـــــ؟"

میں نے ایک نظر نرس کو، پھر ڈاکٹر کو دیکھا اور "نہیں" کہہ کر مختصر سا جواب دیا۔
کیا یہ مجھے انسان سمجھتے ہیں یا بھیڑیا ـــــ؟" میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا لیکن میں نے
س سوال کو وہیں قتل کر دیا۔

مجھے ایک گاربیج GARBAGE بیگ میں سے میرے کپڑے نکال کر دیئے گئے۔ میں نے
دلِ نخواستہ پہنے اور وارڈ میں آ گیا۔

وہ وارڈ بھی عجیب ساخت کا تھا، شاید سو سال پہلے بنا ہو گا۔ ایک لمبا برآمدہ، اور
دو لمبے لمبے ہال، ایک ہال میں بیس مرد اور دوسرے میں بیس عورتیں۔ وارڈ کے دروازے
ہمیشہ مقفل رہتے تاکہ کوئی بھاگ نہ جائے۔ ایک طرف نرسوں کے دفتر تھے، دوسری طرف
مریضوں کے لئے غسل خانے اور ٹائلٹ ـــــ غسل خانے بھی ایسے کہ پردوں سے بے نیاز۔

اس وارڈ کی فضا بھی عجیب تھی، کوئی کسی سے بات نہ کرتا، مریض یا تو خداؤں سے
بات کرتے یا فرشتوں سے، ہواؤں سے یا دیواروں سے، انسانوں سے باتیں کرنا ان کے خیالِ
شان نہیں تھا ـــــ پریشان خیال حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

ایک مریض کہنے لگا۔ "میں خدا کا بیٹا ہوں!"

دوسرا بولا۔ "یہ جھوٹ بولتا ہے!"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے۔؟" تو وہ بے اعتنائی سے کہنے لگا۔

"یہ میرا بیٹا نہیں ہے!" میں مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس وارڈ میں وقت کی رفتار بہت مختلف تھی بلکہ ہر مریض کے لئے وقت کا احساس
مختلف تھا، کوئی برآمدے میں ایسے تیز تیز چلتا جیسے دفتر جانے میں دیر ہو گئی ہو اور کوئی وارڈ
کے بیچ میں ماحول سے بے نیاز گھنٹوں کھڑا رہتا۔

اسی طرح کپڑوں اور بستر کا احساس بھی مختلف تھا، ایک عورت چار چار سویٹر پہن کر
پھرتی اور دوسری قمیص پہننا بھی گوارا نہ کرتی۔ مجھے حیرانی تھی کہ نرسیں اور ڈاکٹر ایسے
ماحول میں کیسے کام کر سکتے ہیں ـــــ؟ کیا ان کا اپنا دماغ متاثر نہیں ہوتا ـــــ؟ پھر مجھے یاد آیا
کہ کسی نے بتایا تھا کہ ماہرینِ نفسیات خودکشی کرنے میں سب سے فہرست ہیں۔ کیا عجب؟

مجھے وارڈ سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے میں مختلف مریضوں اور نرسوں سے باتیں
کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔

میرے ساتھ والے بستر کا مریض کسی سے بات نہ کرتا، حتّٰی کہ ڈاکٹر بھی آتا تو وہ بستر
سے اُٹھ کر واش روم میں چلا جاتا۔ ایک دن ڈاکٹر اور نرس اس کے پیچھے پیچھے گئے تو
اس نے اپنے آپ کو واش روم میں بند کر لیا اور دو گھنٹے تک بند رکھا۔ ڈاکٹر نے بہت
کوشش کی کہ واش روم سے باہر کھڑے ہو کر اس کا انٹرویو لے لیکن وہ خاموش رہا ـــــ
ڈاکٹر آخر تھک ہار کر واپس چلا گیا۔

اگر مریض بے قابو ہونے لگتے تو یا تو انھیں جیل روم BUBBLE ROOM میں بند
کر دیا جاتا یا دو تین نرسیں انھیں پکڑ کر ٹیکے لگا دیتیں۔ وارڈ کیا تھا انسانی لیبارٹری تھی۔

دو دن کے بعد نرس مجھ سے کہنے لگی۔

"ڈاکٹر گولڈن سٹین نے حکم دیا ہے کہ اب تم ورکشاپ جا سکتے ہو!"

"میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"وہ کیوں ـــــ؟" نرس حیران تھی۔

"میں نہ تو نرس ہوں نہ ہی نوکر کہ ڈاکٹر گولڈن سٹین حکم دیتے پھریں۔"

"لیکن یہ تمھارے بھلے کے لئے ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم چند گھنٹوں کیلئے
باہر جا سکتے ہو۔"

"اگر وہ مجھ سے مشورہ کر لیتے تو کیا حرج ہوتا ـــــ؟"

وہ نرس کھسیانی ہنسی ہنسی۔

میں نرس کے ساتھ ورکشاپ چلا گیا لیکن اندر داخل ہوتے ہی ٹھٹھک سا گیا۔

میں نے جو دیکھا مجھے یقین نہ آیا۔

ورکشاپ کے ایک کونے میں بہت سے مرد زور زور سے کرسیوں پر بیٹھے ہل رہے تھے —— ایک عورت کالے لباس میں ملبوس کونے میں کھڑی تھی، اس نے بالوں کے ساتھ سیاہ رسیاں باندھ رکھی تھیں۔ سب کے چہرے بدہیئت تھے، لگتا تھا پورے ملک کے بدصورت انسان اس کمرے میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ کسی کی ناک چپٹی، کسی کی آنکھ بھینگی، کسی کے منھ سے رال ٹپک رہی تھی۔

"میں یہاں نہیں رہنا چاہتا —!" میں نے فیصلہ سُنایا۔

"نہیں نہیں! یہ صرف ورکشاپ کا ایک حصّہ ہے، یہاں صرف مینٹلی ریٹارڈڈ MENTALLY RETARDED کام کرتے ہیں، ہمیں اگلے کمرے میں جانا ہے!"

"کیا وہاں جانے کا کوئی اور راستہ نہیں؟"

"نہیں!"

مجھ پر قدرے وحشت طاری تھی لیکن نرس کے ہمراہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا —— ابھی آدھے راستے میں ہی پہنچا ہوں گا کہ کالے کپڑوں میں ملبوس مریضہ بھاگ کر میرے پاس آئی اور اس نے اپنی قمیص کی آگے کی زپ کھول دی، اس کی دو تھل تھل کرتی ہوئی چھاتیاں باہر آگئیں۔

"ہا ہا! انھیں چھو کر دیکھو!" وہ چلّائی۔

زندگی میں پہلی دفعہ میری گھگّی بندھ گئی تھی، میں گھبرا گیا تھا۔ میں نے نرس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے اطمینان اور سکون سے کہنے لگی۔

"فکر نہ کرو —! یہ سب کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے، تمھیں بھی عادت ہو جائے گی!"

مدّتوں بعد میری سمجھ میں آیا کہ گورکن کیسے لاشوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔

دوسری ورکشاپ قدرے بہتر تھی، اس میں کام کرنے والے انسان کم از کم دیکھنے میں تو نارمل NORMAL لگتے تھے۔ ایک طرف کرسیاں اور میزیں بنائی جا رہی تھیں۔ اور دوسری طرف سیرامکس SERAMICS اور پوٹری POTTERY کا کام ہو رہا تھا، چار پانچ

سلطان تھے اور چالیس پچاس مریض، سب خاموشی لیکن تندہی سے کام کر رہے تھے —— وہ ورکشاپ اسپتال کم اور فیکٹری زیادہ لگ رہی تھی —— مجھے بھی کرسیاں بنانے میں زیادہ مصلحت لگی۔

"اس ورکشاپ کا مقصد کیا ہے۔؟"

"یہ اوکوپیشنل تھیریپی ڈپارٹمنٹ OCCUPATIONAL THERAPY DEPARTMENT ہے، یہاں لوگوں کو پیشہ ورانہ تربیت دی جاتی ہے تاکہ جس دوران وہ ہسپتال میں مقیم ہیں وہ اپنے پیشے سے لاتعلق نہ رہیں۔"

"کیا ترکھانوں کا ذہنی توازن زیادہ خراب ہوتا ہے؟"

نرس مسکرا دی، وہ میرا طنز سمجھ گئی تھی۔

میں کام کرتے ہوئے ماحول کا عادی ہونے کی کوشش کرتا رہا، وارڈ کے بیمار ماحول سے یہ ماحول قدرے بہتر تھا لیکن ساتھ والے کمرے کے بارے میں سوچتا بھی تو ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے۔

اس شام میں واپس اپنے وارڈ میں آیا تو مجھے جنرل ہسپتال کی باتیں یاد آنے لگیں، جہاں میری تم سے ملاقات ہوئی تھی اور جہاں میں ایک مہینہ رہا تھا۔ ان دو ہسپتالوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا —— ایک محل کی طرح تھا —— دوسرا اصطبل کی مانند، اور مجھے احساس ہوا کہ انسان پاگل بھی ہو تو اس کا علاج اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ وہ پیدل چلتا ہے یا جیگور JAGUR کا مالک ہے، بس میں سفر کرتا ہے یا رولز رائس ROLLS ROYCE میں —— کیا ڈالر دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے ——؟ میرے دل میں کسی نے سرگوشی کی۔

اگلے دن بغیر کسی حجت کے میں ورکشاپ پہنچ گیا —— نرسیں خوش تھیں کہ میں رام ہو رہا ہوں —— اور —— حقوق و آزادی کے جھگڑے کھڑے نہیں کر رہا —— وہ تو ایسے مریضوں کی عادی ہو چکی تھیں جو حقوق کے معنی بھی بھول چکے تھے —— ان کے لیے مجھ جیسے انسان کی جو پاگل نہیں تھا نگہداشت کرنی زیادہ مشکل تھی۔

ورکشاپ کے پہلے حصے سے میں آنکھیں بند کئے تیزی سے گزر گیا۔ میں تمل تمل کرتے ہوئے سینے دوبارہ نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے جس کرسی کی دو ٹانگیں پہلے دن بنائی تھیں، اسکی دوسری دو ٹانگیں بنانے لگا۔

کام کرتے کرتے تھک گیا تو عورتوں کے حصے میں چلا گیا۔ چار عورتیں ایک دائرہ بنائے بیٹھی تھیں، ان کے سامنے سیکڑوں بٹن پڑے تھے، وہ چار چار بٹنوں کو پلاسٹک کے ایک چھوٹے سے لفافے میں بند کر رہی تھیں۔ اور ایک دوسرے کو مریضوں کے لطیفے سنا رہی تھیں۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں۔

"شہزادے! ہنسی دکھ کا سب سے بڑا علاج ہے، کیا تمھیں کوئی لطیفہ یاد ہے۔؟"

میری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی۔

"ہاں صرف ایک!"

وہ اپنے بٹن زمین پر رکھ کر بولیں۔

"تو ہمیں بھی سناؤ!"

میں نے کہا۔ "ایک پاگل ہسپتال کے باہر سیر کر رہا تھا، وہ چلتے چلتے سڑک پر پہنچ گیا سڑک کے ایک طرف ایک دیوار تھی اور دوسری طرف نالہ بہہ رہا تھا، پاگل دیوار پر بیٹھ کر آتی جاتی ٹریفک سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اتنے میں وہاں سے ایک کار گزری لیکن ہسپتال کے بالکل سامنے پہنچ کر اس کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اس کا مالک باہر نکلا، پہیے کو غور سے دیکھا، اور پھر ٹائر بدلنے کا انتظام کرنے لگا۔ اس نے پنکچر ٹائر کے بولٹ اتار کر ایک طرف رکھے اور کار کی ڈگی سے سپیئر ٹائر SPARE TYRE نکالنے لگا۔ اتنے میں آندھی چلی اور چاروں بولٹ نالے میں گر گئے۔ ڈرائیور بہت پریشان ہوا۔

پاگل دیوار پر بیٹھا یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ڈرائیور کو پریشان دیکھا تو کہنے لگا۔

"کیوں حضرت پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"ہاں! میرے چاروں بولٹ نالے میں گر گئے ہیں۔"

"تو پھر؟"

"اب میں ٹائر نہیں بدل سکتا!"

"میں ایک مشورہ دوں۔؟"

"وہ کیا۔؟"

"باقی تین ٹائروں سے ایک ایک بولٹ اتار دو، اس چوتھے پہیے کو لگا لو، پھر گیراج سے جا کر بولٹ خرید لینا۔"

وہ ڈرائیور بہت حیران ہوا۔

"کیا تم اس ہسپتال کے پاگل ہو۔؟"

"ہاں میں پاگل ہوں چغد نہیں!"

وہ چاروں عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں، ابھی وہ ہنس ہی رہی تھیں کہ ان کا سپروائزر بھاگا بھاگا آگیا اور بغیر کسی تعارف یا تمہید کے کہنے لگا۔

"محترمات! پچھلے ہفتے ہم صرف چھ سو پیکٹ روزانہ بنا سکے آج سے ہمیں آٹھ سو پیکٹ بنانے ہیں۔ ہمارے خریداروں کی ڈیمانڈ DEMAND بڑھ گئی ہے!"

اچانک عورتوں کے چہروں پر سنجیدگی طاری ہو گئی اور وہ کام میں مصروف ہو گئیں۔

میں منھ لٹکائے کرسی بنانے لگا۔

اگلا دن میرا ہسپتال میں پانچواں دن تھا، مجھے پوری امید تھی کہ مجھے ہسپتال سے چھٹی مل جائے گی، نرسوں نے بھی امید دلائی کہ ڈاکٹر سہ پہر تک شاید مجھے گھر جانے کی اجازت دیدے۔

میں ورکشاپ گیا تو عجب منظر دیکھا۔ سٹیج سجا ہوا تھا اور کرسیاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی تھیں، کسی نے بتایا تھا کہ وہ مریضوں کی گورنمنٹ کی میٹنگ تھی جس میں مریض ہی صدر اور جنرل سیکریٹری تھے اور مریضوں کے مسائل پر بحث ہونی تھی۔

میٹنگ کا آغاز ہوا۔ اسٹیج پر عہدیدار بیٹھ گئے، پہلی قطار میں ورکشاپ کے اسٹاف اور باقی قطاروں میں مریض۔ سب سے پہلے پچھلی میٹنگ کی کارروائی پڑھی گئی جسے سب نے مجموعی طور پر قبول کیا۔ میں ان کے نظم و ضبط سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد نئے ایجنڈے پر بحث ہوئی۔ سب سے زیادہ متنازعہ فیہ مسئلہ مریضوں کے ورکشاپ کے بونس کا تھا۔ مختلف مریضوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا۔

"ہم یہاں گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں۔"

"ہمیں ہسپتال چھوڑ کر شہر میں کام کرنا چاہیے۔"

"ہمیں پچاس سنٹ فی گھنٹہ دینا ناانصافی ہے!"

اتنے میں ایک سپروائزر نے اُٹھ کر صفائی پیش کرنی چاہی ــــــ "یہ جگہ ملازمت کی جگہ نہیں ہے ــــــ یہ ہسپتال ہے اور جو کام یہاں ہوتا ہے وہ جاب JOB نہیں تھیریپی THERAPY ہے۔"

مجھے سپروائزر کا لہجہ اور بات اچھی نہ لگی ــــــ میرے خیال میں اس کا لہجہ ہمدردانہ نہ تھا بلکہ ایسے مالک کا تھا جو کارکنوں کا استحصال کرنا چاہتا ہو۔

بحث کے آخر میں سیکرٹری جنرل نے زوردار قرارداد پیش کی۔

"شہر میں کم سے کم اجرت MINIMUM WAGES پانچ ڈالر فی گھنٹہ ہے، ہمیں صرف پچاس سنٹ فی گھنٹہ ملتا ہے، اگر ہسپتال کی انتظامیہ نے ایک ماہ کے اندر اندر ہمارے مسائل کا حل نہ پیش کیا تو ہم کام کرنا بند کر دیں گے اور ورکشاپ بند ہو جائے گی۔"

سب مریضوں نے حق میں ہاتھ اُٹھایا، میں نے دونوں ہاتھ اُٹھائے ـــ میں اس قرارداد سے خوش تھا۔

اتنے میں ایک سپروائزر پھر کھڑا ہوا۔

"یہ قرارداد غیر مناسب ہے، یہ کوئی لیبر یونین نہیں، ہسپتال کی یونین ہے، ہم مریضوں کی مدد کرتے ہیں، استحصال نہیں کرتے، آپ سب لوگ جذباتی ہو رہے ہیں ــــــ ہم نے آپ سے کبھی غیر مناسب یا ناجائز کام کرنے کو نہیں کہا ــــــ یہ سب آپ کے بھلے کا

کام ہے، یہ تھیریپی ہے!"

مجھے آہستہ آہستہ غصہ چڑھ رہا تھا۔ یہ وہی سپروائزر تھا جس نے عورتوں پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ اس دن سے بٹنوں کے دو سو پیکٹ زیادہ بنائیں۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ سب جھوٹ ہے، دغا ہے۔ یہاں مریضوں کا استحصال ہوتا ہے۔ مریضوں کو ہسپتال میں بہت کم پیسے ملتے ہیں ــــــ اگر یہ تھیریپی ہے تو آپ نے بٹنوں کے زیادہ پیکٹ بنانے کا آرڈر کیوں دیا تھا ــــــ" میں نے سپروائزر سے پوچھا۔

"میں نے ایسا آرڈر نہیں دیا!"

مجھے اور بھی غصہ چڑھ گیا۔ وہ شخص جھوٹ بول رہا تھا۔

"عذرِ گناہ بدتر از گناہ ــــــ ایک تو استحصال کرتے ہو اُوپر سے جھوٹ بولتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی ....."

میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا ــــــ مجھ پر تین اسٹاف جھپٹ پڑے اور مجھے وارڈ میں لے آئے۔

میں وارڈ میں آیا تو ڈاکٹر گولڈسٹین نے کہا۔

"شہزادا! تمہیں میں فارم تھری FROM III پر ڈال رہا ہوں۔ اب تمہیں یہاں پندرہ دن اور ٹھہرنا پڑے گا۔" میں نے جب کہا کہ میں بھاگ جاؤں گا تو کہنے لگا۔

"تمہیں پولیس پکڑ کر لے آئے گی۔"

جیولی! یہ تو اچھا ہوا کہ میری تم سے ٹیلی فون پر بات ہو گئی اور تم رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئیں۔ تمہارا مشورہ کہ یہ میرا قانونی حق ہے کہ میں پیشینٹس ایڈووکیٹ PATIENT'S ADVOCATE سے بات کروں اور ریویو بورڈ REVIEW BOARD کے لئے اپلائی APPLY کروں بہت سودمند ثابت ہوا ــــــ میں اگر پندرہ دن اور یہاں رہتا تو آدھا پاگل تو ہو ہی جاتا۔

آج صبح ریویو بورڈ کی میٹنگ ہوئی ــــــ میز کے گرد جج، دو وکیل، ایک اجنبی ماہرِ نفسیات، ڈاکٹر گولڈسٹین اور میرا سوشل ورکر بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر گولڈسٹین نے میرے

غصے کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔

میں نے بتایا کہ میں غصیلا ہی سہی لیکن پاگل نہیں ہوں ــــ جب انسانوں کا استحصال ہوتے دیکھتا ہوں تو آپے سے باہر ہو جاتا ہوں ــــ میں مسائل کا اس وقت زیادہ شکار ہوتا ہوں جب شراب یا منشیات میرے اعصاب پر سوار ہوتے ہیں۔

میرا ڈاکٹر میرے گھر جانے کے حق میں نہ تھا اور سوشل ورکر نے مشورہ دیا کہ میں بورڈنگ ہوم BOARDING HOME میں جا کر رہوں۔

چنانچہ جج نے فیصلہ سنایا کہ اگر میں بورڈنگ ہوم میں جانے کا اور ڈرگ سینٹر سے رجوع کرنے کا وعدہ کروں تو مجھے کل چھٹی مل سکتی ہے ــــ میں نے وہ دونوں شرائط قبول کر لیں اور فیصلہ میرے حق میں ہو گیا۔

میں سہ پہر کو جھیل کے کنارے بیٹھا پانی میں کنکر پھینک رہا تھا تو ایک اور واقعہ پیش آیا ــــ ایسا واقعہ کہ احساس ہوا کہ ہم سب زندگی میں اپنے اپنے نقطۂ نظر کے کیسے اسیر ہوتے ہیں۔

میں گھاس پر بیٹھا تھا کہ ایک عورت کا قریب سے گزر ہوا، وہ مجھے دیکھ کر رک گئی۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی ــــ چھوٹا سا قد، چپٹی ناک، چھوٹی آنکھیں، چھوٹے کالے بال۔ شکل سے چینی لگ رہی تھی۔ اور عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"تم اکیلے بیٹھے ہو۔؟"

"تم بھی آکر بیٹھ جاؤ ــــ ہم پانی میں اکٹھے پتھر پھینکیں گے۔" میں بھی مسکرایا۔ وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"تم بہت خوش لگ رہے ہو ــــ!" اس نے جھیل میں پتھر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ــــ میں اس جیل سے کل نکل رہا ہوں ــــ میرے سوشل ورکر نے بتایا ہے کہ ایک بورڈنگ ہوم میں جگہ خالی ہے!"

"چھوٹی جیل سے بڑی جیل جا رہے ہو ــــ!" وہ طنزیہ ہنسی ہنسی۔

"نہیں ــــ میں آزاد ہو جاؤں گا ــــ ریویو بورڈ نے میرے حق میں فیصلہ دیا ہے۔"

میں مصر تھا۔

"آزادی کا تعلق اندر کی دنیا سے ہے، باہر کی دنیا سے نہیں ــــ!" اس کی آنکھوں میں دانائی اور شرارت کے ملے جلے جذبات تھے۔

"میں سمجھا نہیں!"

"جس جگہ کو انسان اپنا سمجھے وہ اس کا گھر بن جاتا ہے ــــ یہ میرا گھر ہے!"

"تم ہسپتال کو اپنا گھر سمجھتی ہو ــــ کب سے یہاں ہو ــــ؟"

"پندرہ سال سے ــــ ہم اسے ہسپتال نہیں 'شہر سکون' کہتے ہیں ــــ یہ آشتی اور سکون کی بستی ہے ــــ لوگ جب یہاں آتے ہیں تو بہت پریشان و مضطرب ہوتے ہیں لیکن مسکن ادویہ ان کے اضطراب میں کمی کر دیتی ہیں اور پھر نرسوں، ڈاکٹروں اور دیگر مریضوں کی مدد سے ان کی زندگی میں آرام اور راحت بھر جاتی ہے ــــ چند دن اور رہ کر دیکھو۔ پسند کرنے لگو گے!"

"تم عجیب عورت ہو ــــ مجھے ہسپتال میں رہنے کی دعوت دیتی ہو ــــ"

"تم عجیب آدمی ہو ــــ سکون کو چھوڑ کر دکھوں کے شہر میں جانے پر مصر ہو جہاں تمہاری جان، مال اور عزت کچھ بھی محفوظ نہیں۔"

"لیکن یہاں مریضوں کا استحصال ہوتا ہے ــــ وہ دن بھر محنت کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں لیکن انہیں صرف پچاس سنٹ فی گھنٹہ ملتا ہے!"

"تم بہت سادہ ہو ــــ!" وہ ہنسی۔ "جب تک تم یہاں چند ماہ نہ رہ لو، تمہیں ایسی باتیں کرنے کا حق نہیں ــــ یہاں کی زندگی کمیون COMMUNE کی زندگی کی طرح ہے۔ مجھے یہاں اسرائیل کے کبوتز KIBBUTZ یاد آتے ہیں۔ یہاں مساوات ہے ــــ ہر شخص ایک ہی طرح کا کھانا کھاتا ہے، ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتا ہے، ایک ہی طرح کے بستر پر سوتا ہے اور اپنی استطاعت کے مطابق کام کرتا ہے ــــ جہاں تک پچاس سنٹ فی گھنٹہ کی بات ہے تو وہ جیب خرچ ہے۔ اگر انہیں پانچ ڈالر فی گھنٹہ ملنے لگیں تو پھر انہیں کھانے پینے اور رہنے کی بھی قیمت ادا کرنی ہوگی۔"

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔۔۔

"لیکن یہاں سیر و تفریح کا انتظام نہیں!"

"جھیل ہے، باغات ہیں، خوب صورت گھاس ہے، سیگلز SEAGULS ہیں۔۔۔ اور کیا چاہیئے؟"

"مجھے بیر BEER کی اشتہا ہے۔!" میں نے متاثر ہوتے ہوئے بھی مذاقاً کہا۔

وہ چینی عورت اٹھی۔۔۔ "میں نے تمھیں اپنا نام نہیں بتایا، میں میری چنگ ہوں!"

"اور میں شہزاد ملک!"

"آؤ۔۔۔ میرے پیچھے آؤ۔۔!"

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ تقریباً سو گز چل کر میری نے گھاس ٹٹولا اور زمین کھودنے لگی۔

تھوڑی دیر میں میری نے ایک بیر کی بوتل نکالی، دانتوں سے اس کا ڈھکنا کھولا، اور مجھے بوتل پیش کر دی، میں ہکا بکا رہ گیا۔

"ہمیں جو جیب خرچ ملتا ہے ہم اس سے چاکلیٹ اور بیر خریدتے ہیں۔ ہر وارڈ کے مریضوں نے اپنے لئے ایک خاص علاقہ منتخب کر رکھا ہے، ہم وہاں اپنی بیر چھپا دیتے ہیں تاکہ نرسوں کو پتہ نہ چلے۔۔۔ اگلی دفعہ آنا تو ہمارے 'شہر سکون' میں چند مہینے رہنا۔"

میں مسکراتا اور سر ہلاتا اپنے وارڈ میں چلا گیا۔

جولی! میں کل صبح بورڈنگ ہوم چلا جاؤں گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ میں وہاں زیادہ دنوں نہ رہ پاؤں گا۔۔۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی بورڈنگ ہوم جا چکا ہوں۔۔۔ میری اماں مجھے گھر لے جاتی ہیں۔۔۔ وہ ان بورڈنگ ہوموں کی حالتِ زار دیکھ کر جہاں نیچی چھتیں، ایک ایک کمرے میں چار چار لوگ، جن میں سے اکثر سگریٹ، شراب اور منشیات میں ملوث ہوتے ہیں اور گھر کی فضا کو دھوئیں اور گالیوں سے مکدر کر دیتے ہیں۔۔۔ زندہ قبریں کہہ کر پکارتی ہیں!

جولی۔۔! مجھے تم بہت یاد آتی ہو، تمھارے سنہری بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی

کرنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ تم واحد انسان ہو جس کے سامنے میں اپنے دل کا حال بغیر سوچے سمجھے بیان کر دیتا ہوں، چاہے وہ ہوش کی باتیں ہوں یا دیوانگی کی۔

کتنا ہی اچھا ہو کہ ہم ویکینڈ WEEKEND کے لئے اس شہر سے باہر چلے جائیں میں اپنے گھر والوں اور تم اپنے ہسپتال والوں سے دور۔۔۔ مونٹریال یا کیوبک سٹی کا کیا خیال ہے۔۔۔ ایک رومانوی ویکینڈ۔۔۔ جہاں ہم زندگی کی ساری تلخیوں کو ایک دوسرے کی قربت میں گھول کر پی جائیں۔

تمھارا۔۔۔

شہزاد

rekhta

"جولی! سچ پوچھو تو مجھے یقین نہیں آتا کہ ہم مونٹریال کے ایک ہوٹل میں تنہا ہیں۔ یہ معجزے سے کم نہیں ــــ جب سے تم سے ملاقات ہوئی تھی میں سوچا کرتا تھا کہ کاش ہم ایک دن شہر سے بہت دُور ویک اینڈ کے لئے چلے جائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اتنا وقت گزاریں کہ ایک دوسرے کو جان جائیں ــــ ہم ٹورانٹو میں رہ کر حالات کی زد میں رہتے تھے ــــ میں اور میرے گھر والے ــــ تم اور تمہارے رفقائے کار ہماری زندگیاں مشکل بنا رہے تھے۔"

جولی آئینے کے سامنے کھڑی تھی ــــ اس نے بالوں میں سے ربن اور کانوں کی بالیاں اتار کر میز پر رکھیں، اپنی قمیص اتاری اور تہہ کر کے کرسی پر بچھا دی، پھر اپنی سکرٹ اتاری اور ہینگر پر لٹکا دی۔

جولی نے آئینے میں شہزاد کو آنکھ ماری اور پھر اس کے پہلو میں آ کر لیٹ گئی

"ہوٹل کا کمرہ برا نہیں!"

"برا نہیں کیا مطلب ــــ بہت عمدہ ہے ــــ نہ صرف ٹی وی اور ٹیلی فون ہے

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

بلکہ چائے، کافی بنانے کا انتظام اور چھوٹا سا فریج بھی ہے۔"

"مجھے تو ان کا غسل خانہ پسند آیا۔ اُن کا شاور ایسا ہے جو مَساج MASSAGE بھی کرتا ہے۔"

"چلو صبح اکٹھے شاور لیں گے۔"

جیوتی نے شہزاد کے ماتھے پر، پھر رُخسار پر اور پھر ہونٹوں پر بوسہ دیا۔۔۔ اس کی قمیص کے بٹن کھولنے لگی۔

وہ کافی دیر تک ایک دوسرے کے جسموں کو سہلاتے، چومتے اور گدگداتے رہے۔ ہنسی تھی کہ ان کی پسلیوں سے نکلی پڑتی تھی۔

"جیوتی اگر تمہاری آنکھیں بند ہوں اور مجھے پچاس مردوں میں سے پہچاننا ہو تو کیسے پہچانو گی۔۔۔؟"

"تمہاری ہنسی سے۔۔۔! میں نے ایسی ہنسی پہلے کبھی نہیں سُنی۔۔۔ اور اگر تم کو آنکھیں بند کر کے مجھے پچاس عورتوں میں سے پہچاننا ہو تو کیسے پہچانو گے۔؟"

"تمہاری خوشبو سے۔۔۔! تمہارے جسم کی منفرد خوشبو ہے۔۔۔ مٹی کی خوشبو کی طرح۔ ایسی مٹی جس پر پانی چھڑکا گیا ہو!"

شہزاد، جیوتی کو آغوش میں لئے کافی دیر تک خاموش رہا۔۔۔ وہ اس کے جسم کی تمام تر حدّت کو جذب کر لینا چاہتا تھا۔ پھر وہ بولا

"جیوتی! میں نے تمہیں اپنے خاندان کے بارے میں بہت کچھ بتایا لیکن تم نے کبھی تفصیل سے ذکر نہ کیا۔"

"میں تمہیں افسردہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"کوئی بات نہیں، کچھ تو بتاؤ۔"

"میرا باپ ایک ویک اینڈ الکوہولک WEEKEND ALCOHOLIC تھا۔ سارا ویک اینڈ بیئر پیتا رہتا اور جب بہت پی لیتا تو گھر میں اُودھم مچاتا۔۔۔ گالی گلوچ، حتّیٰ کہ مار پیٹ کرتا۔ میری ماں کے جسم اور میری رُوح پر آج بھی زخموں کے بہت سے نشان ہیں۔۔۔ لیکن سارا ہفتہ فرشتوں کی طرح رہتا۔

وہ ایک ڈرگ کمپنی کا سیلزمین تھا۔۔۔ دراز قد، خوش شکل اور باتونی۔۔۔ لوگ میری ماں سے پوچھتے کہ تم اس شرابی کے ساتھ کیوں رہتی ہو تو وہ کہتیں۔۔۔ "وہ مجھ سے مُحبّت کرتا ہے، شرابی ہے لیکن دل کا مخلص ہے!"

"اور تمہاری ماں!"

"وہ بے چاری گھر کا خیال رکھتیں اور میری پرورش کرتیں۔۔۔ ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔۔۔ پھر میرے باپ کا ایکسیڈنٹ ACCIDENT ہو گیا، اور وہ مر گیا۔۔۔ میری ماں اور مجھ پر بہت بُرے دن گزرے۔۔۔

کسی نے ماں کو مشورہ دیا کہ ٹورانٹو چلی آئیں۔۔۔ انھوں نے یہاں آکر نرسنگ اسسٹنٹ NURSING ASSISTANT کا کورس کیا اور میری دیکھ بھال کی۔۔۔ میں اس وقت بارہ سال کی تھی۔۔۔ مجھے کبھی اپنا باپ بہت یاد آتا۔۔۔ میں رات رات بھر رویا کرتی اور ڈراؤنے خواب دیکھا کرتی۔۔۔ میری ماں کی بہت خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بن جاؤں۔"

"لیکن تم دل کی اتنی اچھی کیسے ہو۔؟"

وہ شرمائی۔

"میں بچپن سے ہی نرم دل ہوا کرتی تھی، کئی دفعہ راہ چلتے کتّوں اور بلّیوں کو گھر لے آئی اور ماں سے کہا۔ یہ سردی میں مر جائیں گے۔۔۔ ماں بھی انھیں چند دن کے لئے رکھ لیا کرتی تھی۔۔۔"

"پھر تم مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہو۔؟"

"تم مجھے اچھے لگتے ہو۔۔۔!" جیوتی نے اسے زور سے گلے سے لگا لیا۔ "تم بہت دیانتدار اور صاف گو آدمی ہو۔ تم نے مجھے کبھی دھوکے میں نہیں رکھا۔۔۔ میں جانتی تھی کہ ہسپتال کا سٹاف تم سے سختی سے پیش آتا تھا، اس لئے مجھے تم سے ہمدردی ہو گئی اور آہستہ آہستہ وہ ہمدردی محبت میں تبدیل ہوتی گئی۔"

"جیوتی! میں جب تم سے ملا تھا تو تباہی کی آخری حدوں تک پہنچ چکا تھا۔ میں خودکشی

کے بارے میں اکثر سوچا کرتا تھا، اگر تم سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید میں اپنی جان بھی لے چکا ہوتا۔

اس رات دونوں کافی دیر تک اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ آخر شہزاد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم پلز PILLS پر ہو۔" وہ اپنی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔

جیولی کی آنکھیں ٹمٹمائیں۔ "ہاں!"

اور وہ دونوں ایک دفعہ پھر بغلگیر ہو گئے۔

شہزاد غسلخانے میں آئینے کے سامنے شیو بناتے ہوئے گنگنا رہا تھا ؎

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

باہر جیولی زور زور سے ہنس رہی تھی۔

"ہنس کیوں رہی ہو — کوئی لطیفہ یاد آ گیا۔"

"نہیں — رات کی بات!"

شہزاد چہرے پر جھاگ اور ہاتھ میں ریزر لئے باہر آ گیا، وہ جیولی کا چہرہ دیکھ کر بات کرنا چاہتا تھا۔

"کیوں کیا ہوا۔"

"یاد ہے تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں پلز پر ہوں۔"

"ہاں! اور تم نے کہا تھا کہ تم ہو!"

"میرا مطلب وٹامن پلز VITAMIN PILLS سے تھا —" اور وہ زور زور سے

ھر ہنسنے لگی۔

شہزاد کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

"اگر تم حاملہ ہو گئیں تو —؟"

"نہیں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ دس سال سے کوشش کرتی رہی تھی لیکن ناکام رہی۔ خر میں نے پلز ہی کھانی چھوڑ دیں۔"

"جیولی یہ بتاؤ کہ اگر ہسپتال والوں کو پتہ چل جائے کہ تم میرے ساتھ رہی ہو — تو یا ہوگا؟"

"نہ صرف میری ملازمت بلکہ میڈیکل لائسنس بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔"

"وہ کیوں؟"

"ہم جس فرسودہ ماحول میں بس رہے ہیں وہاں ڈاکٹر اور مریض کے تعلقات یر قانونی ہیں۔"

وہ دونوں اپنا اپنا سوٹ کیس لے کر باہر نکلے اور دروازے کو تالا لگا رہے تھے کیا دیکھتے ہیں کہ جیولی کے وارڈ کی نرس سنتھیا اور اس کا پولیس افسر خاوند دوسری طرف سے آ رہے تھے۔ جیولی اور شہزاد اگر دو منٹ پہلے یا بعد میں نکلتے تو اس حادثے سے بچ جاتے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے۔ اور ہونٹوں کی ہنسی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کمرۂ عدالت کی فضا دبیز خاموشی کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایسی خاموشی جس
کوکھ میں بہت سی حسرتیں اور آہیں دم توڑ رہی تھیں۔

وہ عدالت کا تیسرا دن تھا — شہزاد کے والدین، چند احباب اور ریچل آنکھوں
آنسو لئے بیٹھے تھے۔ وکیل کاغذات کی چھان بین کر رہے تھے۔ اور شہزاد ایک طرف وحش
بھری آنکھوں سے دیواروں پر آویزاں تصویروں کو گھور رہا تھا۔

جج نے باقی کارروائی اور شہادتوں کے بیان لئے۔

وکیل نے بتایا کہ شہزاد واردات کے دن بلور سٹریٹ پر گھوم رہا تھا کہ وہ سینڈو
کی دوکان میں داخل ہوا۔ اس نے ابھی اپنے لئے سینڈوچ کا آرڈر ہی دیا تھا کہ دو، میر
پنک PUNK دوکان میں داخل ہوئے اور شہزاد سے آگے بڑھ گئے۔ شہزاد نے
انہیں روکا تو انہوں نے اسے 'پاکی' کہہ کر دھکا دیا۔ شہزاد نے بھی غصے میں انہیں دھکی
تو ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ دوکان کے مالک نے سب کو باہر نکال دیا۔ اس واقعہ کے
تھوڑی دیر کے بعد شہزاد نے دوا ایمفیٹامین AMPHETAMINE کے انجکشن لگائے

ریچل نے بیان دیا کہ جب اسے شہزاد کا فون ملا تو وہ اس کی آواز سے ہی جان گئی تھی کہ اس کی طبیعت بہت خراب ہے، وہ چیخ چلّا رہا تھا۔ ریچل نے بڑی مشکل سے معلوم کیا کہ وہ کہاں ہے۔ جب وہ بھاگی بھاگی وہاں پہنچی تو شہزاد ایک پبلک واش روم میں آئینے کے سامنے کھڑا زور زور سے گالیاں بک رہا تھا۔

"میں شیطان ہوں ــــ یہ سب شیطان ہیں ــــ یہ میری مجبوری جلد کے خلاف ہیں۔ یہ کتے کے بچے مجھے قتل کر دینا چاہتے ہیں، چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔"

ریچل نے اسے تسلّی دی، لیکن وہ غصے سے کانپ رہا تھا ــــ پہلے وہ اسے جنرل ہسپتال لے گئی جہاں اسے انتظار گاہ میں ایک گھنٹہ ٹھہرنا پڑا تھا ــــــــــــ

ریچل کو احساس ہو چکا تھا کہ ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں نرسوں اور ڈاکٹروں کی پرایرٹیز PRIORITIES کیا ہیں۔ جسمانی بیماریوں کی باری پہلے آتی ہے اور ذہنی بیماروں کی باری آخر میں ــــ نرس نے اس کی پرانی فائل منگوائی اور ڈاکٹر نے اسے پڑھ کر کہا کہ شہزاد کو پچھلی دفعہ فارم ون FORM I پر ڈالا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جب ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے تو وائلنٹ VIOLENT ہو جاتا ہے، اس لئے وہ اسے داخل نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر نے ریچل کو مشورہ دیا کہ وہ اسے سائیکاٹرک ہسپتال لے جائے۔ چنانچہ ریچل اسے دوسرے ہسپتال لے گئی۔ وہاں کے ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو کہنے لگا کہ شہزاد منشیات استعمال کرتا ہے اس لئے وہ اس کا علاج نہیں کر سکتے اسے ڈرگ ٹریٹمنٹ سینٹر DRUG TREATMENT CENTRE میں لے جا کر داخل کرایا جائے۔ ریچل اسے اس سینٹر لے گئی۔ انہوں نے اس کا انٹرویو لیا اور فیصلہ سنایا کہ وہ اسے داخل تو نہیں کر سکتے البتہ اسے ہفتے میں ایک دفعہ کاؤنسلنگ COUNSELLING کے لئے دیکھ لیں گے۔

"تو یہ رہے گا کہاں؟" ریچل نے غصے سے پوچھا۔

"اسے کسی بورڈنگ ہوم میں لے جاؤ!" اور نرس نے ایک کاغذ پر پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھ کر دے دیا۔

ریچل اسے بورڈنگ ہوم لے گئی لیکن وہاں کوئی کمرہ یا بستر خالی نہ تھا، اس دوران

رات ہونے لگی تھی اور ریچل اس فضول بھاگ دوڑ سے تنگ آ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ آج رات وہ گھر پر رہے تو اگلے دن اسے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس لے جائے گی جو اس کے ہسپتال میں داخلے کا انتظام کر دے گا۔

ریچل نے شہزاد کو اس کے گھر چھوڑا اگلے دن دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

شہزاد نے اپنے کمرے میں جاتے ہی ٹیپ ریکارڈ چلایا اور زور زور سے موسیقی بجانے لگا۔ اس کے والدین، چچا اور چچی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ چند لمحے تو انہوں نے برداشت کیا لیکن جب موسیقی آہستہ نہ ہوئی تو اس کی والدہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئیں۔ شہزاد کی حالت دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور وہ دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو آتے دیکھا تو چلّایا۔

"تم کون ہو۔؟"

"میں تمہاری ماں ہوں بیٹا!"

"نہیں نہیں ــــ تم چڑیل ہو ــــ تم مجھے قتل کر دینا چاہتی ہو ــــ تم مجھے پانی میں زہر ملا کر کے پلاتی ہو تاکہ میں مر جاؤں۔" اور وہ ایک ڈراؤنی ہنسی ہنسا۔

"ایسی باتیں نہ کرو بیٹا ــــ میرا دل نہ دکھاؤ ــــ آؤ! نیچے ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔"

شہزاد بھاگتا ہوا نیچے آیا لیکن اپنے چچا کو دیکھ کر اس کا خون پھر کھولنے لگا ــــ اس کے رشید چچا نے بھی تیز موسیقی سے تنگ آ کر کہا۔

"اب کیا ڈھونگ رچایا ہے ــــ اب کسے بے وقوف بنا رہے ہو ــــ ڈاکٹروں، نرسوں، ویلفیئر WELFARE اور ایمپلائمنٹ سینٹر EMPLOYMENT CENTRE والوں کی آنکھوں میں تو دھول جھونک چکے ہو، اب کس کی باری ہے۔؟"

شہزاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے چچا پر جھپٹ پڑا۔

"تم ــــ! جب تک زندہ ہو مجھے سکون نہیں مل سکتا ــــ تم شیطان ہو ــــ سب سے بڑے شیطان ــــ میں تمہیں اس دنیا سے ختم کر کے ہی دم لوں گا۔"

پھر شہزاد نے آگے بڑھ کر اس کی وہیل چیئر کو ٹھوکر ماری اور اس کی گردن کے مفلر کو پکڑ کر

زور سے کھینچا۔

یہ سب اتنا آناً فاناً ہوا کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے — پھر اس سے پہلے کہ اس کا باپ بڑھ کر اسے روکتا، فہزاد نے چچا کو گھسیٹا۔ اس کے چچا کا سر زور سے ساتھ والی میز کے کونے سے ٹکرایا اور اس کے منھ سے چیخ نکلی — دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔

شہزاد نے اتنا ڈھیر سارا خون دیکھا تو گھبرا گیا اور "شیطان شیطان" چیختا گھر سے بھاگ گیا۔

پولیس کو اسے گلیوں میں تلاش کرنے میں تین گھنٹے لگے۔

اس کی ماں نے جب عدالت میں بیان دیا تو اس کی سسکیاں اور ہچکیاں رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں — اس کی آواز رُندھ گئی تھی اور اسے کئی دفعہ بیان کے دوران پانی پلایا گیا تھا۔

جج نے تفصیلات سُن کر فیصلہ سُنایا۔

"شہزاد ملک نے اقرار کیا ہے کہ اس نے اپنے چچا کو قتل کیا تھا لیکن بیانات اور ڈاکٹر کی رپورٹ سے واضح ہے کہ وہ اس وقت اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا، اس لئے اسے علاج کے لئے صوبے کے شمال میں میکسیمم سیکورٹی ہسپتال MAXIMUM SECURITY HOSPITAL بھیجا جائے گا، جہاں اس کے ذہنی مرض کا علاج لیفٹیننٹ گورنر کے وارنٹ کے تحت ہوگا اور ہر سال ایک ریویو بورڈ کے سامنے اس کا کیس پیش کیا جائے گا تاکہ اس کی ذہنی صحت کا اندازہ لگایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تمام ہسپتالوں اور ڈرگ سنٹر کے ملازمین کی تفتیش ہوگی جنھوں نے واردات کی شام کو شہزاد ملک کا معائنہ کیا تھا لیکن علاج کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

شہزاد ملک کو دوسرے ہسپتال بھیج دیا گیا۔

صُبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا

اسے آخر یوں لگا جیسے وہ زندگی کا جوا ہار چکا ہو، اس کے ڈرامے کا آخری پلاٹ نزدیک ہو اور وہ اس مریض کی طرح ہو جو رات بھر اس امید پر جاگتا رہا ہو کہ پو پھٹتے ہی کوئی مسیحا اس کے کمرے میں داخل ہوگا لیکن اب اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئی ہوں اور وہ جانتا ہو کہ اگر ایک دفعہ اس نے آنکھیں موند لیں تو پھر وہ کبھی نہ کھول سکے گا

"خودکشی اتنی بری چیز تو نہیں ـــ" اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

اس کی پوری زندگی کی چند جھلکیاں بار بار اس کے ذہن میں ابھریں ـــ کینیڈا ہجرت کرنا ـــ ماں باپ سے چپقلش ـــ ایمفیٹامین کا کاروبار ـــ چچا کا قتل ـــ جیولی سے ملاقات ـــ لیکن وہ سب یادیں دھواں دھواں ہو چکی تھیں ـــ وہ ایسے موڑ پر پہنچ چکا تھا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا ـــ اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتا تو پتھر کا ہو جاتا ـــ

اسے اس کوٹھری میں آٹھ مہینے ہو گئے تھے ـــ وہ لڑ لڑ کر تھک گیا تھا ـــ اس

کوٹھری کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے نحوست ٹپکتی تھی۔ صرف ایک بدبودار چادر، کمبل اور تکیہ اس کی ملکیت تھے۔ دروازے میں ایک سوراخ تھا جس سے ہسپتال کے ٹھیکیدار نرس اندر جھانک کر دیکھتے اور اگر وہ سگریٹ باہر نکالتا تو وہ دروازہ کھولے بغیر جلا دیتے۔

اس نے اپنے بازوؤں کی طرف دیکھا تو اسے بہت سے زخم نظر آئے۔ ایک دن اس نے اپنے جسم کو سگریٹ سے جلانے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ اپنی سادگی پر ہنس پڑا تھا۔ کنکروں سے بھی کبھی ہاتھی مرتے ہیں۔

وہ اس ہسپتال کے بدترین وارڈ میں تھا جس کا نام ڈی (D) تھا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں سی (C) بی (B) اور اے (A) وارڈ بھی ہیں لیکن وہ اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ کچھ مریض اور اسٹاف ڈی کو طنزاً ڈینجرس DANGEROUS وارڈ بھی کہا کرتے تھے۔ اگرچہ اسے وہاں آٹھ مہینے ہو گئے تھے لیکن اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ نہ اسے کھانا کھانے میں مزا آتا نہ سانس لینے میں۔

وہ وارڈ شاید جیل کی کوٹھری سے بھی بدتر تھا۔ نہ کوئی کھیل نہ تفریح، نہ ٹی وی نہ اخبار نہ رسالہ۔ انسانی دماغ بے حس ہو کر ماؤف ہو جائے۔ وہ کبھی کبھار اپنی ٹانگوں پر چٹکیاں لے کر یہ باور کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ زندہ ہے۔

ایسی زندگی کا کیا فائدہ جب زندہ رہنے کا احساس ہی مٹ جائے۔ ہر وارڈ کے دروازے پر بڑے بڑے قفل لگے ہوئے تھے اور نرسوں کی بیلٹوں کے ساتھ موٹی موٹی چابیوں کے گچھے لٹکے ہوتے۔ نہ نرس اس سے سیدھے منہ بات کرتے اور نہ وہ ان سے۔ ان کے درمیان ایک سرد جنگ جاری تھی ـــ

وہ اپنی کوٹھری کے ایک کونے میں چیونٹیوں کی قطار کو دیکھنے لگا ـــ اگر میں چیونٹی ہوتا تو کیا ہوتا ـــ وہ اپنی روٹی کا ایک ٹکڑا وہاں پھینک دیتا اور چیونٹیوں کی قطار کو بغور دیکھتا رہتا یہ اس کی سب سے بڑی تفریح تھی۔

ہفتے میں صرف اتوار کا دن پانچ منٹ کی مسکراہٹ لے کر آتا ـــ اسے ایک فون کرنے کی اجازت ہوتی ـــ وہ ایک ہفتے اپنی ماں کو فون کرتا اور ایک ہفتے جیولی کو ـــ

کسی کو اس ہسپتال میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہ ہسپتال بھی ایسا تھا کہ اس کی ایک فٹ موٹی اور پندرہ فٹ بلند دیواریں اور ان دیواروں پر کھمبوں کی باڑ، کسی کے بھی حوصلے پست کرنے کے لئے کافی تھیں —

شہزاد نے خودکشی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا تھا لیکن کامیابی کی کوئی صورت نہ آئی تھی۔

اس نے اپنے سینے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ آٹھ مہینوں میں اس نے نہ جانے کتنا وزن ضائع کیا تھا — وہ ایک ایک پسلی کو محسوس کر سکتا تھا۔

اگر میں زندہ نہ رہا تو کسی کو کیا نقصان پہنچے گا۔ سب کے سر سے بوجھ اتر جائے گا — گھر والوں کو شرم سے اور جیوتی کو پریشانی سے نجات ملے گی۔ اور وہ خود "میں پاگل ہوں یا مجرم"۔ کے دن رات کے سوال سے نجات پا جائے گا۔

اس کوٹھری میں نہ زہر مل سکتا تھا نہ وہ دریا میں کود سکتا تھا اور نہ ہی وہاں بندوق میسر تھی — اس کی آنکھوں میں مایوسیاں بڑھ گئی تھیں۔

پچھلے ہفتے اس کی ماں نے روتے روتے بتایا تھا کہ اس کے والد کو ہارٹ اٹیک HEART ATTACK ہو گیا تھا اور وہ واپس پاکستان جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

ایک دن پہلے جب اس نے جیوتی کو فون کیا تھا تو اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے جیوتی؟"

"کچھ نہیں"! اور وہ رونے لگی۔ شہزاد سمجھ گیا کہ وہ کوئی خاص بات چھپا رہی ہے شہزاد ٹیلی فون تھامے کھڑا رہا — اور جیوتی سسکیاں لیتی رہی — شہزاد کے ذہن میں سیکڑوں وسوسے سر ابھار رہے تھے — پانچ منٹ ختم ہوئے تو ایک نرس نے اس کا ٹیلی فون پکڑ لیا۔ اس نے بہت کہا — ایک منٹ ٹھہر جاؤ، ایمرجنسی ہے —" لیکن نرس نے "تمہاری بات ہمیشہ ایمرجنسی ہوتی ہے"! کہتے ہوئے ٹیلی فون چھین لیا، شہزاد نے غصے میں دیوار کو ٹھوکر ماری اور نرس کو ایک تھپڑ جڑ دیا۔

پھر کیا تھا — تین نرسوں نے اسے پکڑا اور علیحدہ کمرے میں لے جا کر اس کے

ہاتھ پاؤں باندھ دیئے — وہ ان نرسوں سے تنگ آچکا تھا۔ وہ انھیں نرس کم اور جلاد زیادہ سمجھتا تھا — "میں مر جاؤں گا لیکن ان کتے کے بچوں سے تعاون نہیں کروں گا —!"

وہ گھنٹوں بندھا رہا ہر گھنٹے کے بعد ایک نرس آکر پوچھتی کہ کیا وہ معافی مانگنے کو تیار ہے لیکن وہ انکار کر دیتا —

شام کو نیا ہیڈ نرس ایڈورڈ آیا۔ اس نے پہلے اس وارڈ میں کبھی کام نہ کیا تھا لیکن اس نے شہزاد کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ نرسوں نے اسے شہزاد کے غصے کی کہانی سنائی تو وہ مسکرا دیا۔

ایڈورڈ وارڈ کا راؤنڈ ختم کر چکا تو شہزاد کے کمرے میں گیا — وہ زمین پر نڈھال پڑا ہوا تھا — اس نے اپنا تعارف کروایا اور بغیر کوئی سوال پوچھے یا وعدہ لئے اس کے ہاتھ پاؤں کھولے اور کہا۔

"چلو! ہم کہیں بیٹھ کر باتیں کریں!"

"میں باتیں نہیں کرنا چاہتا!"

"شہزاد — ! غصہ تھوک دو، میں تمہارا دوست ہوں، دشمن نہیں!"

"پہلے مجھے سگریٹ دو، پھر باتیں کریں گے"۔ شہزاد جانتا تھا کہ سگریٹ دینا وارڈ کے قوانین کے خلاف تھا۔

ایڈورڈ نے جیب سے سگریٹ نکال کر دیا تو شہزاد بہت حیران ہوا — برف پگھلی تو شہزاد نے اپنی ساری رام کہانی سنا دی — ایڈورڈ حقیقتاً ایک ہمدرد انسان تھا — اس نے جیوتی کا پتہ لیا اور اسے اپنے پیسوں سے ایک تار دیا اور حالات جاننے کی خواہش کا اظہار کیا۔

شہزاد سوچتا رہا کہ یہ سب مہربانیاں، یہ سب کرم، یہ سب نوازشیں بلبلے ہیں بلبلے جو دکھوں اور غموں کی سطح پر ابھرتے ہیں اور پھٹ جاتے ہیں۔

اس کی مایوسی کی شدت نے اسے ایک تجویز سجھائی — وہ اپنی قمیص پھاڑ کر سوچنے

لگا کہ اگر وہ دروازے کے کونے سے رسی کی طرح باندھ دے اور اس سے لٹک جائے تو چند منٹوں میں عمر بھر کا غم تمام ہو سکتا ہے ـــــ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے!

وہ ابھی قمیص پھاڑ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایڈورڈ ایک کاغذ لئے داخل ہوا، اس کے چہرے پر کلیاں چٹک رہی تھیں ـــــ اس نے شہزاد کی پھٹی ہوئی قمیص دیکھا تو سمجھ گیا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لئے خاموش رہا پھر بولا۔

شہزاد! تمھارے لئے ایک خوش خبری لایا ہوں۔"

شہزاد اس موڑ پر پہنچ چکا تھا جہاں خوش خبری کا خیال بھی میلوں دور تھا اس کے لئے موت وہ واحد خوش خبری تھی جو اسے زندگی کے دکھوں سے نجات دلا سکتی تھی۔ ایڈورڈ نے خاموشی سے ایک تار اس کے آگے بڑھا دیا۔ تحریر تھا،

DEAR SHAHZAD !

SORRY FOR NOT LETTING YOU KNOW EARLIER. I HAD A BABY - YOUR SON - I WISH YOU WERE HERE ——JULIE

شہزاد کی آنکھوں میں بے یقینی کے آنسو تیر گئے۔

ایڈورڈ کمرے میں آیا تو شہزاد اس سے لپٹ گیا۔

"ایڈورڈ! تم کتنے مہربان ہو!"

"آؤ چائے پئیں اور باتیں کریں!" ایڈورڈ مسکرایا۔

"میں روز وہ تار دن میں بیسیوں بار پڑھتا تھا لیکن مجھے یقین نہ آتا تھا ـــــ آٹھ مہینوں کی سرنگ کے بعد خوشی کی ایک کرن ـــــ لیکن آج میں نے خود جولی سے بات کی ہے، وہ خوشی سے رو رہی تھی، پھر اس نے فون کا ریسیور اس کے قریب کیا تو میں نے اپنے بچے کی آواز سنی، وہ چلا رہا تھا۔

"مبارک ہو ـــــ اس کا نام کیا ہے؟"

"اس کا نام ـــــ ایڈم ہے ـــــ ایڈم آنلڈ ملک ـــــ جولی نے بتایا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو آٹھ پونڈ کا تھا ـــــ اب دس پونڈ کا ہے ـــــ دن بھر سوتا رہتا ہے، اور رات بھر جاگتا رہتا ہے ـــــ میں بھی بچپن میں ایسا ہی ہوا کرتا تھا ـــــ کاش میں اسے دیکھ سکتا ـــــ ایڈورڈ ـــــ میرے دوست! تم میری مدد کرو ـــــ میں اب زندہ رہنا

چاہتا ہوں، اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں۔"

"دیکھو شہزاد! اگر تم سنجیدہ ہو اور صرف جذبات میں ایسی باتیں نہیں کر رہے تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اگر تم آج سے یہاں کے اسٹاف کو گالیاں، تھپڑ اور ٹھوکریں مارنے کی بجائے ان سے مسکرا کر ملو، ان کی باتیں مانو، پروگرام اٹینڈ ATTEND کرو تو میں ان سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں ـــــ اگر تم شرافت کا مظاہرہ کرو تو ایک مہینے کے بعد 'سی' وارڈ میں پھر 'بی' اور 'اے' وارڈ میں منتقل ہو سکتے ہو اور تین چار مہینوں کے بعد وہ تمہیں ٹورانٹو کے سائیکاٹرک ہسپتال بھیج سکتے ہیں، جہاں تمہیں اپنے بیٹے ایڈم کو ملنے کی اجازت مل سکتی ہے!"

"میں قسم کھا کر وعدہ کرتا ہوں کہ ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

دونوں نے پُرجوش طریقے سے ہاتھ ملائے۔ دونوں اپنی اپنی بات کے پکے تھے ـــ ایڈورڈ ہر قیمت پر شہزاد کی مدد کرنے کو تلا ہوا تھا۔

چار مہینے کے بعد جب شہزاد ٹورانٹو کے ہسپتال میں منتقل ہو رہا تھا تو ایڈورڈ اس سے گلے ملا۔

"دوست! یہ میرا پتہ ہے، مجھے ایڈم کی تصویر ضرور بھیجنا میں منتظر رہوں گا۔"

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

شہزاد نے تین بجے سہ پہر ایڈم کو بے بی سٹر BABY SITTER سے اٹھا
تو وہ کہنے لگی: "یہ ایک دو گھنٹے سے ذرا سست سا نظر آ رہا ہے!"

"تھک گیا ہوگا۔۔۔ شرارتی بہت ہے!" کہہ کر شہزاد اس کو کار میں لے آ
اور پچھلی سیٹ پر اس کی کرسی میں ڈال کر بیلٹ باندھنے لگا۔ اکثر اوقات ایڈم ہاتھ پاؤں مار
کرتا تھا لیکن اس سہ پہر وہ خاموشی سے بندھنے کو تیار ہو گیا۔ شہزاد کو حیرانگی تو ہو
لیکن وہ زیادہ متفکر نہ ہوا۔

گھر پہنچنے پر شہزاد اسے اندر لے آیا۔۔۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ ایڈم کا
ماتھا گرم تھا۔ اس نے ایڈم کو دودھ پلانے کے لئے اسے اُبالا، پھر ٹھنڈا کیا۔۔۔ وہ اب تک
بچے کی دیکھ بھال کے چند گُر سیکھ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت پر دودھ کے چند قطرے
ڈالے تاکہ چیک کر لے کہ دودھ زیادہ گرم نہ ہو۔ اس نے دودھ پلانے کی کوشش کی لیکن ایڈ
نے انکار کر دیا۔ وہ اپنے بستر میں لیٹا تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

شہزاد کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اس وقت ساڑھے تین بجے تھے، اجولی کام سے

چھ سات بجے آتی تھی۔ "وہ تین ساڑھے تین گھنٹے کیا کرے گا؟" وہ سوچنے لگا۔

اس نے وفورِ جذبات میں "ایڈم" کہا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"ڈیڈی!" ایڈم نے مضمحل انداز میں کہا اور آگے کچھ نہ کہہ سکا ـــــ وہ نڈھال لگ رہا تھا۔ لفظ "ڈیڈی" شہزاد کے لئے کتنا قیمتی تھا۔ اس ایک لفظ میں کتنے جہاں آباد تھے۔ شہزاد نے غور سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹا جو اس کی کل کائنات تھا۔ جو اسے موت کی دوزخ سے گھسیٹ لایا تھا۔ جس نے اسے دوبارہ زندہ رہنے کی امید دلائی تھی۔

شہزاد کی آنکھوں کے سامنے پچھلے سال کے مناظر بکھر گئے۔ اس ایک سال میں اس کے ایڈم اور جیولی کے ساتھ تعلقات میں کتنے اُونچ نیچ آئے تھے۔

اسے وہ صبح اچھی طرح یاد تھی جب اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا اور اُسے سُورج، گھاس اور جھیل ہی نہیں ساری دُنیا ہی خوبصورت نظر آ رہی تھی ـــــ یہ وہی سپتال تھا جہاں وہ ایک سال پہلے بھی ایک ہفتے کے لئے آیا تھا لیکن اب وہ طویل عرصے کے لئے آیا تھا، اس لئے ایک ایسے وارڈ میں تھا جہاں کا ماحول قدرے پُرسکون تھا ـــــ ے چینی عورت کی بات یاد آئی تھی کہ اگلی دفعہ آنا تو چند مہینے رہنا۔

وہ اپنے بیٹے اور محبوبہ سے ملنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے کر ٹائی کی ناٹ KNOT درست کی تو ایک مریض نے پُوچھا۔

"بہت خوش لگتے ہو؟"

"ہاں! یہ میری زندگی کا خوش قسمت ترین دن ہے!"

"وہ کیسے؟"

"میں اپنے بیٹے سے ملنے جا رہا ہوں!"

"اس کی عمر کیا ہے؟"

"ساڑھے چار مہینے!"

"پہلے کب ملے تھے؟"

"آج پہلی دفعہ ملنے جا رہا ہوں!"

اس مریض نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا تھا کہ میں ہی دیوانہ ہُوں!"

اس نے بیٹے کے لئے اتنے ڈھیروں کھلونے اور کپڑے خریدے تھے جیسے اسے اگلے دو سال کپڑوں اور کھلونوں کی ضرورت نہ پڑے گی۔

بیٹے سے پہلی دفعہ ملنا بھی قیامت تھی ـــــ کبھی وہ ہنستا، کبھی وہ روتا، کبھی اسے چو کبھی گلے لگاتا ـــــ اس کی نیلی آنکھیں اور کالے بال جیولی اور شہزاد کی میراث کی نشان دہی کر رہے تھے ـــــ اس نے بیٹے کے سراپا کو اتنا چوما کہ اسے اچانک احسا ہوا کہ جیولی قریب کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی ـــــ اسے ڈر لگا کہ کہیں وہ یہ نہ محسوس کرے کہ وہ اسے نظر انداز کر رہا ہے۔

پھر وہ جیولی سے گلے لگ کر بہت ہنسا اور رویا تھا ـــــ اس نے ایک د میں شاید پُوری زندگی سے زیادہ آنسو بہائے تھے اور اسے یُوں لگا تھا جیسے اس کی ذات کا بہت سا زہر آنسو بن کر بہہ گیا ہو ـــــ اس شام کے بعد وہ اندر سے ٹوٹا سا بل گیا تھا ـــــ

پہلے چند مہینے تو ہنی مون کے تھے — جولی، شہزاد اور ایڈم ساتویں آسمان پر اُڑ رہے تھے — اگرچہ شہزاد ہسپتال میں تھا لیکن دن بھر ورکشاپ میں کام کرتا اور سہ پہر کو ایڈم اور جولی سے ملنے آجاتا — اسے شام کے چار پانچ گھنٹوں کی اجازت ہوتی لیکن اس کا ہسپتال میں رات کو سونا ضروری تھا۔

شہزاد کا اپنے بیٹے کے ساتھ وقت گزارنا نعمتِ غیر مترقبہ تھا — اگر اس کا بس چلتا تو وہ دن رات اس کے ساتھ گزارتا — وہ اس کی زندگی کا مرکز تھا — اسے دُودھ پلانا، کپڑے بدلنا اور سیر کے لئے لے جانا اس کی زندگی کے محور تھے۔

اسے وہ شام یاد تھی جب ایڈم نے پہلی دفعہ بیٹھنا اور کھڑا ہونا سیکھا تھا۔ اور اس کے لئے وہ صبح تو عید کی صبح تھی جب اس نے بیٹے کے منہ سے ڈیڈی کا لفظ سنا تھا —

اسے وہ سہ پہر بھی یاد تھی جب جولی بہت جذباتی ہوگئی تھی اور کہنے لگی تھی۔

"شہزاد! میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے — میں نے تمہیں نو مہینے دھوکے میں رکھا — مجھے خطرہ تھا کہ تم مجھ سے بالکل بات نہ کرو گے، مجھے دھتکار دو گے — مجھے اتنی ندامت تھی کہ میں نے پلز PILLS نہ کھائیں — مجھے اس سے زیادہ عقل ہونی چاہیے تھی۔"

شہزاد نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"جولی! پریشان نہ ہو، جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ ہمیں ماضی پر آنسو نہ بہانے چاہئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمیں ایڈم کیسے ملتا۔؟"

دونوں ایک دوسرے کے گن گاتے تھے — لیکن شہزاد کو چند مہینوں کے بعد جولی میں کچھ تبدیلیاں محسوس ہوئی تھیں — وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی — کبھی کبھار گھبرائی سی — اس کی مسکراہٹ فضاؤں میں تحلیل ہو رہی تھی — اگر وہ پوچھتا "جولی کیا بات ہے —؟" تو وہ "کچھ نہیں!" کہہ کر ٹال جاتی۔

شہزاد نے بستر کی طرف دیکھا تو ایڈم کا سانس کچھ اور بھی اُکھڑا ہوا تھا — اس نے بیٹے کو کار میں ڈالا اور ہسپتال لے گیا۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا۔

"مسٹر ملک! اچھا کیا آپ لے آئے، اگر دیر کر دیتے تو نمونیہ ہونے کا خطرہ تھا۔ ایکسرے اور بلڈ ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بچوں کی اسپرین اور اینٹی بائیوٹکس ANTI BIOTICK دیں اور ہر چار گھنٹے کے بعد پلانے کا مشورہ دیا۔

شہزاد واپس آیا تو وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"آخر جولی اتنی پریشان کیوں رہتی ہے —؟ کیا وہ تعلقات سے بیزار ہوگئی ہے یا حالات سے دل برداشتہ۔؟"

وہ واپس آئی تو شہزاد نے بتایا کہ ایڈم بیمار تھا اس لئے اُسے ہسپتال لے گیا تھا اور اب دوائیاں پلا کر سُلا دیا ہے!

"لیکن مجھے فون کیوں نہیں کیا۔؟"

"میں نے سوچا تم کام کر رہی ہوگی!"

"لیکن میں بھی تو ڈاکٹر ہوں۔"

"میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا — بعض دفعہ میں بھول جاتا ہوں کہ تم خود بھی ڈاکٹر ہو۔"

جب شہزاد ہسپتال واپس جا رہا تھا تو وہ جانتا تھا کہ جیوتی اس کی بات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی اور بدستور اکھڑی اکھڑی سی تھی۔

زندگی اپنی جب اِس طَور سے گزری غالبؔ

کمرے کے در و دیوار سے سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔ درمیان میں ایک بھاری بھرکم
میز تھا، اس کے گرد بھاری بھرکم کرسیاں اور ان کرسیوں پر بھاری بھرکم حیثیتوں کے
ـــــ ایک طرف کالج کے معزز و معتبر ڈاکٹر اور وکیل اور دوسری طرف جیولی
اس کا وکیل۔

رائل کالج کی ڈسپلن کمیٹی کا چیئرمین ہاتھ میں بھاری بھرکم فائل اٹھائے کمرے
داخل ہُوا تو سب ادب سے کھڑے ہو گئے ـــــ سفید بال، دراز قد اور ناک پر جمی ہُوئی
اس کی سنجیدگی کی آئینہ دار تھی ـــــ

جیولی نے چاروں طرف دیکھا تو اسے دیواروں پر کچھ ایسے ہی بزرگوں کی فریم شدہ
تصویریں نظر آئیں جو شاید ماضی کے چیئرمین تھے۔

چیئرمین نے سب کا تعارف کروایا، کارروائی کی تمہید باندھی اور پھر اصل مقصد
طرف لوٹا۔

ڈاکٹر جیولی آرنلڈ! آپ پر یہ الزام ہے کہ آپ جب سکاربرو کے ہسپتال میں اپنی

ٹریننگ کر رہی تھیں اس وقت آپ کی مُلاقات شہزاد ملک سے ہُوئی جو آپ کا مریض تھا ـــــ
آپ اس مریض سے رومانوی اور پھر جنسی طور پر ملوث ہوئیں اور آپ کے یہاں ایک بیٹا بھی پیدا
ہُوا ـــــ رائل کالج کی روایات اور قوانین کے مطابق جب کوئی ڈاکٹر اپنے مریض سے جنسی طور
پر ملوث ہو جائے تو اس سے اس کا لائسنس واپس لے لیا جاتا ہے ـــــ آپ اپنی صفائی
میں کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

جیولی نے باقی لوگوں کی طرف دیکھا وہ سب مہر بلب تھے ـــــ عدالت کا سا ماحول تھا
اور جیولی کو اپنی معصومیت بیان کرنی تھی ـــــ اس نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔

"مجھے اس کارروائی پر کئی اعتراض ہیں ـــــ میرا خیال ہے کہ یہ روایت اس مفروضے کی
وجہ سے ہے کہ ڈاکٹر اور مریض کے درمیان جنسی تعلقات ہمیشہ نقصان دہ ہوتے ہیں ـــــ یہ
عین ممکن ہے کہ اکثر اوقات ہوتے بھی ہوں لیکن ہم اسے سب کے لئے اصول نہیں بنا
سکتے اور جو اس اصول پر عمل نہ کر سکے اسے مجرم نہیں سمجھ سکتے ـــــ میری نگاہ میں میری
قربت نے شہزاد ملک کو بہت فائدہ پہنچایا ہے جبکہ باقی لوگ اسے حقارت اور نفرت
سے ملتے تھے۔

ڈاکٹر اور مریض کے سب رشتے ایک جیسے نہیں ہوتے ـــــ اگر ایک گاؤں میں ایک
ڈاکٹر جاتا ہے اور اس گاؤں میں کوئی اور ڈاکٹر نہیں ہوتا تو وہ پُورے گاؤں کا ڈاکٹر
بن جاتا ہے ـــــ کیا اس کا مطلب یہ ہُوا کہ اگر وہ جوانی کے دس سال اس گاؤں میں گزارے
تو وہ کسی سے بھی رومانوی طور پر ملوث نہیں ہو سکتا ـــــ وہ مریض جو ڈاکٹر کے پاس
ہفتے سائیکوتھریپی PSYCHOTHERAPY کے لئے جاتا ہے اس مریض سے مختلف ہے
سال میں ایک دفعہ نزلہ زکام کے علاج کے لئے جاتا ہے۔

میں درجنوں ڈاکٹروں کی مثال دے سکتی ہُوں جنھوں نے اپنے مریضوں سے
شادی کر لی لیکن کبھی مجرم نہیں سمجھے گئے ـــــ لیکن چونکہ ہم شادی شدہ نہیں اسلئے
موردِ عتاب ہیں۔ مجھے اس جنسی اور اخلاقی تعصب پر شکایت ہے ـــــ میرے خیال میں کالج
کے قوانین اور روایات پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔

چیئرمین نے وکیل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا — "کیا آپ بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وکیل نے پہلو بدلا، گلا صاف کیا اور بولا — "ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جب شہزاد ملک ہسپتال سے منتقل ہو گیا تو وہ ڈاکٹر جیولی آرنلڈ کا قانونی طور پر مریض نہ رہا، اس لئے جب وہ رومانوی طور پر INVOLVE ہوا تو وہ ان کا مریض نہ تھا اور دو بالغ لوگوں کے درمیان رومانوی تعلق ان کا ذاتی عمل ہے جس میں قانون کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں!"

چیئرمین نے سب کچھ سن کر کہا۔

"اب ہماری ڈسپلن کمیٹی کی جداگانہ میٹنگ ہوگی اور چند ہفتوں کے بعد آپ کو فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔"

جیولی اور اس کا وکیل واپس لوٹ آئے۔

جاناکہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

ایک شام شہزاد شہر کی سیر کرنے نکلا چونکہ وہ سالانہ سی، این، ای C.N.E. CANDIAN NATIONAL EXHIBITION کا دَور تھا۔ اس لئے پورے شہر ٹورانٹو میں بہت ہلچل تھی۔ اس نے سب وے SUBWAY لی اور ڈاؤن ٹاؤن DOWN TOWN کی طرف چل دیا۔

سب وے میں گھما گھمی تھی ___ وہ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا ___ چاروں طرف گورے، کالے، مرد، عورتیں، بچے، چینی، فلپینی، ہندوستانی، گویا ہر رنگ، نسل اور زبان کے لوگ بیٹھے تھے ___ یہی شہر ٹورانٹو کی خصوصیت تھی ___ اگلے اسٹاپ پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص سوار ہوا۔ درمیانہ قد، لمبے گھنگھریالے بال، شیو کیا ہوا چہرہ، اوورکوٹ پہنے، ہاتھ میں کتاب لئے جس پر ویلیوز VALUES لکھا تھا ___ وہ شہزاد کے سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ماحول سے قطع تعلق کتاب پڑھنے لگا ___ اس شخص نے ایک ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر نیوفن لینڈ NEWFOUNDLAND لکھا تھا ___ اس شخص کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی، سکون تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد نوجوانوں کا ایک ٹولہ سب وے میں چڑھا۔ پہلے تو وہ ہنس کھیل رہے تھے لیکن پھر انھوں نے لوگوں کا مذاق اڑانا شروع کیا ___ پہلے وہ ایک کالے مرد کے پاس گئے جو سو رہا تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر سلیپنگ نگر SLEEPING NIGGER کہہ کر ایسے چیخے کہ وہ نہ صرف جاگ گیا بلکہ غصے میں بڑبڑانے لگا۔ شہزاد کا خون کھولنے لگا ___ وہ ایک غریب اور معصوم انسان کا مذاق اڑتے نہ دیکھ سکتا تھا۔

اتنے میں وہ نوجوان ادھیڑ عمر کے شخص کے پاس آ گئے جو کتاب پڑھنے میں مصروف تھا ___ انھوں نے اس کی ٹوپی پر نیوفن لینڈ لکھا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی ___ وہ نیوفی NEWFIE لطیفہ سنا کر اس کا مضحکہ اڑانے لگے ___ شہزاد کو ان کی یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔

ایک بولا۔ "نیوفی عقلمند ہوتے ہیں"

دوسرا۔ "بہت ہی عقلمند!"

تیسرا۔ "تمھیں ایک نیوفی لطیفہ سناؤں۔"

چوتھا۔ "سناؤ!"

تیسرا۔ "ایک نیوفی مرد ایک کلب میں گیا، اس نے ایک لڑکی اٹھائی اور اسے گھر لے گیا۔ رات اس کے ساتھ سویا ___ صبح جب وہ لڑکی اپنے گھر جانے لگی تو اس مرد نے اس سے کہا۔

"کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔"

"وہ کیا۔" لڑکی بولی۔

"تمھیں ایڈز AIDS تو نہیں ہے۔"

"نہیں!"

"شکر ہے ___ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے دوسری دفعہ ایڈز ہو جائے۔" اور سب لوگ قہقہے لگانے لگے۔

وہ شخص پھر بھی کتاب پڑھتا رہا۔

شہزاد کو مین لینڈ MAINLAND کے نوجوان بہت منہ پھٹ لگے ___ وہ غصے میں بولا۔

"میں بھی تمھیں ایک لطیفہ سُناتا ہوں!"

"وہ کیا؟" سب ہی بول پڑے۔

"جب نیوفن لینڈ کا کینیڈا سے الحاق نہیں ہوا تھا تو قانون تھا کہ دونوں ممالک اپنے اپنے پانیوں میں مچھلیاں پکڑا کریں گے ___ ایک دن ایک نیوفن لینڈ کا مچھیرا کینیڈا کے پانیوں میں پکڑا گیا۔

"آپ کینیڈا کے پانی میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔؟" اس پر اعتراض ہوا۔

"لیکن میں صرف نیو لینڈ کی مچھلیاں پکڑتا ہوں، مین لینڈ کی چھوڑ دیتا ہوں۔!"

"ان میں فرق کیا ہے۔؟"

"میں مچھلی پکڑنے کے بعد اس کا منہ دیکھتا ہوں، اگر اس کا منہ بہت بڑا ہوا تو واپس پانی میں پھینک دیتا ہوں کیوں کہ جان لیتا ہوں کہ وہ مین لینڈ کی ہے!"

سب نوجوان کھسیانی ہنسی ہنسنے لگے۔

اتنے میں ادھیڑ عمر کے شخص نے اپنی جیب سے چکلٹ CHICLET نکالے ___ اور نوجوانوں میں بانٹ دیے۔ وہ نوجوان چکلٹ لے کر اگلے اسٹاپ پر اتر گئے لیکن شہزاد حیران و ششدر رہ گیا۔

وہ اس ادھیڑ عمر کے شخص سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کے بارے میں مزید جاننے کا تہیّہ کر لیا۔

شہزاد اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"میرا نام شہزاد ہے!" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"میں ابراہیم ہوں!" وہ متین لہجے میں مسکرایا۔

"یہ نوجوان بہت بدتمیز تھے ___ ذلیل کہیں کے۔"

"نا سمجھ ہیں!"

"مجھے تو انھوں نے بہت غصہ دلایا ___ آپ کو غصہ نہیں آیا۔؟"

"جو انسان گھر سے کسی مقصد کے تحت نکلتا ہے تو اسے غصہ کم آتا ہے!"

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟"

"ایک پروفیسر کا لیکچر سننے ___ اگر چلنا ہو تو ساتھ چلو۔"

شہزاد سراپا تجسس بنا اس کے ہمراہ ہو گیا ___ اسے اس شخص میں کچھ پُراسراریت نظر آ رہی تھی۔ وہ سڑک پر ایسے سکون سے چل رہا تھا جیسے بطخیں سطحِ آب پر تیرتی ہیں یا پرندے ہواؤں میں اُڑتے ہیں۔

چہل قدمی کرتے ہوئے شہزاد کو یہ بات تنگ کر رہی تھی کہ اس شخص کو غصہ کیوں نہ آیا۔ چنانچہ وہ بولا ___ "میں آپ کی بات سمجھا نہیں ___ کسی مقصد کے تحت نکلنا اور غصے کا کیا تعلق ہے۔؟"

"شہزاد بیٹا ___! میں تمھیں ایک کہانی سُناتا ہوں ___" ابراہیم کی شفقتِ پدری سطح پر آ گئی تھی۔

"سنائیے!" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"ایک بزرگ کے پاس جن کا نام خضر تھا ایک نوجوان آیا اور کہنے لگا ___ "میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں اور زندہ رہنے کا فن سیکھنا چاہتا ہوں!"

خضر نے اسے بہت ٹالنا چاہا لیکن وہ مصر تھا ___ خضر جانتا تھا کہ وہ نوجوان بہت غصیلا تھا ___ جب نوجوان بالکل نہ مانا تو خضر نے ایک شرط پر اپنی شاگردی میں قبول کر لیا۔

"دیکھو ___! اگر تم میرے شاگرد بننا چاہتے ہو تو ایک شرط ہے، میں جو کہوں گا تمھیں کرنا پڑے گا!"

"مجھے منظور ہے!" کہہ کر وہ خضر کے ساتھ چل پڑا۔

دونوں چلتے چلتے اندرونِ شہر پہنچے۔

ایک گھر کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور گانے بجانے اور شراب نوشی میں

مصروف تھے۔ شاید کوئی خوشی کی تقریب تھی۔

خضر نے نشے میں دُھت ایک مرد کو دیکھا اور اپنے شاگرد سے کہا ——"جاؤ اس کو تھپڑ لگاؤ۔"

"یہ تو سراسر ظلم ہے!"

"کیا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے ——؟" خضر نے یاد دہانی کرائی۔

جب اس نوجوان نے شرابی کو تھپڑ لگایا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا —— دونوں ہی لڑنے لگے —— لوگ جمع ہو گئے —— پولیس بلوائی گئی، رپٹ لکھوائی گئی اور ساری تقریب درہم برہم ہو گئی۔

خضر اور وہ نوجوان کچھ اور آگے بڑھے تو انہیں ایک پارک میں ایک سیاسی لیڈر نظر آیا جو انتہائی جوش و خروش کے ساتھ تقریر کر رہا تھا اور ووٹ حاصل کرنے کی درخواست کر رہا تھا۔

"جاؤ، اس مقرر کو تھپڑ لگاؤ۔" خضر نے حکم دیا۔

"یہ زیادتی ہے!"

"تمہارا وعدہ ——؟"

جب اس نوجوان نے مقرر کو تھپڑ لگایا تو وہ غصے میں آ گیا —— اس نے شرابی کی طرح ہاتھا پائی تو نہ کی لیکن گالم گلوچ پر اتر آیا۔ اتنے میں سارا مجمع تتر بتر ہو گیا روائی ختم ہوئی تو لوگ جا چکے تھے۔

خضر اور نوجوان اور آگے بڑھ گئے۔

ایک سفید ریش بوڑھا جو استاد تھا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھا اپنے طلبہ کو سبق پڑھا رہا تھا —— خضر نے اسے دیکھا اور اپنے شاگرد سے کہا۔

"جاؤ اب اس بوڑھے کو بھی تھپڑ لگاؤ۔"

"یہ تو گناہ ہے!"

"اپنا وعدہ بھول گئے ——؟"

وعدہ یاد دلانے پر اس نوجوان نے بوڑھے کو بھی تھپڑ رسید کیا۔ بوڑھے نے حیرت سے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میں آپ کو نہیں جانتا، نہ جانے آپ نے مجھے تھپڑ کیوں مارا ہے، شاید آپ کے پاس اس کا کوئی جواز ہو لیکن اس وقت میں ایک اہم کام میں مشغول ہوں، اس لئے آپ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا ——" اتنا کہہ کر وہ بوڑھا آدمی ایک بار پھر اپنے درس میں مشغول ہو گیا۔

وہ نوجوان بہت حیران ہوا۔

خضر نے بتایا کہ وہ شرابی اور مقرر گھر سے جو مقصد لے کر نکلے تھے وہ حالات کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہو گئے جبکہ وہ بوڑھا شخص اپنے مقصد پر قائم تھا۔

شہزاد، ابراہیم سے بہت متاثر ہوا اور اس نے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ابراہیم نے اپنا پتہ اور ٹیلی فون دیتے ہوئے کہا —— میں نیوفن لینڈ سے صرف چند دنوں کیلئے ٹورانٹو آیا ہوں، تم جب چاہو چلے آنا۔"

ایک شام شہزاد ابراہیم سے ملنے گیا جو ایک چھوٹے سے کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک بستر تھا، دو کرسیاں اور ایک میز۔ ایک طرف دو الماریاں اور ایک سٹوو STOVE تھا۔ ابراہیم نے چائے بنائی۔ الماری سے چند بسکٹ نکالے۔ پلیٹ میں سجائے اور دونوں باتیں کرنے لگے —— شہزاد اس شخص سے اتنا متاثر تھا کہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا —— آخر اس سے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی بیٹھا ——

"آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔"

ابراہیم مسکرا دیا اور بولا۔

کیا بتاؤں شہزاد! میری عمر ساٹھ کے قریب ہے۔ نیوفن لینڈ میں پلا بڑھا —— جوانی میں مرغ لاڑ دُنیا کی سیر کی —— ساری عمر مچھلیاں پکڑتا رہا —— شادی کی —— دو بچے پیدا کئے —— بچے جوان ہوئے، ان کی شادیاں کیں وہ چلے گئے اور بیوی بھی داغِ مفارقت دے گئی۔ اب میں نے سینٹ جانز SAINT JOHNS میں ایک مچھلی کی دوکان کھولی ہے، جہاں لوگ

دوپہر اور شام کا کھانا کھانے آتے ہیں!"

"کیا آپ اکیلے کام کرتے ہیں؟"

"نہیں! میرے ساتھ ایک نوجوان آدمی بیٹھ کر کام کرتا ہے۔ جب میں شہر سے باہر ہوتا ہوں تو وہی کاروبار سنبھالتا ہے، مخلص اور قابلِ اعتماد آدمی ہے!"

"لیکن آپ بہت دانا اور جہاندیدہ معلوم ہوتے ہیں!"

"کیا کہوں بیٹا — زندگی سب سے بڑی دانش گاہ اور انسانی تجربہ سب سے بڑا استاد ہے — زندگی کی ٹھوکریں بہت کچھ سکھا دیتی ہیں — میں آج بھی حقیقت کا متلاشی ہوں، جہاں کہیں روشنی کی کرن دیکھتا ہوں کھنچا چلا آتا ہوں، جہاں کوئی مہربان شخص دیکھتا ہوں اس کے ساتھ چل پڑتا ہوں — مجھے انسانوں سے بہت محبت ہے!"

"آپ ٹورانٹو کس سلسلے میں آئے تھے؟"

"میں ہر سال دو تین ہفتوں کے لیے نیوفن لینڈ سے باہر چلا جاتا ہوں۔ اس دفعہ ٹورانٹو میں 'انسانی اقدار' پر ایک کانفرنس تھی، سوچا میں بھی کچھ سیکھ لوں — دیکھو شہزاد تمھاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے!"

شہزاد گفتگو میں اتنا محو تھا کہ ماحول اور چائے سے بے خبر ہو گیا تھا۔

"تم نے اپنے بارے میں کبھی زیادہ نہیں بتایا۔" ابراہیم نے پوچھا۔

"میں ایک بہت ہی ذلیل زندگی گزار رہا ہوں — میں پاگل خانے میں رہتا ہوں، صرف شام کو نکلنے کی اجازت ملتی ہے — میں پہلے بہت غصے اور نفرت سے بھرا رہتا تھا لیکن اب......"

"اب کیا......؟"

"جب سے میرا بیٹا ایڈم پیدا ہوا ہے میری زندگی میں کچھ سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔"

"تم خوش قسمت ہو کہ تم نے زندگی کا مقصد دریافت کر لیا ہے لیکن تم نے ایڈم

کی والدہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"جیولی — وہ ایک زمانے میں میری ڈاکٹر تھی — اب میری محبوبہ اور میرے بیٹے کی ماں ہے لیکن میرے اتنے قریب آنے پر اس کے رفقائے کار اس سے ناراض ہیں!"

"زندگی میں محبت کی قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے!"

وہ ان کی آخری ملاقات تھی — ابراہیم اگلے دن واپس نیوفن لینڈ جا رہا تھا — اس نے رخصت ہوتے کہا۔

"اگر کبھی موقع ملے تو نیوفن لینڈ آنا — بہت خوب صورت جزیرہ ہے، امید ہے تمھیں پسند آئے گا۔ میرا خیال ہے ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں!"

"میرا بھی یہی خیال ہے!"

شہزاد نے اس کا نیوفن لینڈ کا ٹیلی فون نمبر اور پتہ لیا اور واپس ہسپتال کی طرف چل دیا — اسے ابراہیم سے مل کر بہت مسرت ہوئی تھی۔

rekhta

وہی ہال، وہی میز، وہی کرسیاں، وہی در و دیوار اور وہی دیواروں پر تصویریں۔

شہزاد کو ڈیجاوو DEJAVU کا سا احساس ہوا ــــ صرف اتنا فرق تھا کہ کہانی کے کردار مختلف تھے ــــ زندگی کی طرح جہاں اسٹیج وہی رہتا ہے لیکن کرداروں کے نام بدلتے رہتے ہیں۔

پہلی دفعہ شہزاد ریویو بورڈ کے سامنے اس لئے پیش ہوا تھا کہ وہ ہسپتال سے مستقل چھٹی لے اب وہ صرف گھر رہنے کی اجازت چاہتا تھا۔

میز کے ایک طرف جج، وکیل، ایک عام شہری اور ایک ماہرِ نفسیات بیٹھے تھے دوسری طرف شہزاد اور اس کا وکیل خلیل۔

"کیا تمھارا نام شہزاد ملک ہے ــــ؟" جج نے حکمانہ انداز میں پوچھا۔

"جی ہاں!"

"تم نے ہی اپنے چچا کا قتل کیا تھا؟"

"جی ہاں!"

rekhta

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

"تم اس لئے جیل نہ گئے کہ تم ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔"

"جی ہاں!"

شہزاد کا دل بیٹھنے لگا ـــــ وہ قاتل بھی تھا اور ذہنی مریض بھی ـــــ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے اُبھرنے لگے۔

ڈاکٹر شلٹز نے طویل رپورٹ پیش کی جس کے آخر میں کہا۔

"شہزاد ملک پہلے سے بہت بہتر ہو چکا ہے۔ اس کا رویہ بدل گیا ہے، وہ کافی ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے، نرسیں اس سے بہت خوش ہیں، وہ اپنے پروگرام باقاعدگی سے اٹینڈ کرتا ہے ـــــ میرا خیال ہے کہ اگر وہ گھر میں رہے اور پروگرام کے لئے ہفتے میں دو دفعہ ہسپتال آجایا کرے تو کافی ہوگا ـــــ میری نگاہ میں اس کا ہسپتال میں رہنا ضروری نہیں۔"

سب کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی کو یہ تجویز پسند نہ تھی۔

ایک وکیل بولا ـــــ "بات معمولی نہیں ـــــ جب تک شہزاد پوری طرح STABLE نہ ہو جائے رسک RISK لینا ٹھیک نہیں ـــــ شہر میں قتل کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔"

شہزاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا وہ وکیل دراز قد، مونچھوں والا شخص تھا جو بہت سخت دل لگتا تھا۔

طویل بحث ہوئی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ڈاکٹر شلٹز کی مدد کرنے کی کوشش ریت میں پیشاب کرنے کی طرح تھا ـــــ جج نے فیصلہ دیا کہ شہزاد کو مزید مراعات نہ ملیں گی۔ اگلے سال دوبارہ ریویو ہوگا اور اسے اس وقت تک ہسپتال میں سونا پڑے گا۔"

شہزاد سارا دن بجھا بجھا سا رہا ـــــ اس کا دل کچھ بھی کرنے کو نہ چاہتا تھا ـــــ شام کو سلیم اسے زبردستی پارٹی میں لے گیا ـــــ وہ چلا تو گیا لیکن افسردہ خاطر ـــــ کئی لوگوں نے اس سے گپ شپ لگانے کی کوشش لیکن وہ زیادہ دیر گفتگو نہ کر سکا ـــــ وہ ایک کونے میں بیٹھا شراب پیتا رہا۔

وہ چند لمحوں کے لئے اس وقت ہنسا جب اسے پرانا دوست جانتھن ملا جسے اس نے بہت عرصے سے نہ دیکھا تھا ـــــ جانتھن ایک کھلنڈرا جوان تھا جو ہر وقت ہنسی مذاق میں مشغول رہتا۔ وہ شہزاد کو دیکھتے ہی چہک پڑا۔

"کیا حال ہیں شہزاد۔"

"گزارہ ہے ـــــ اور تم ـــــ"

"خوش ہوں، زندگی سے کوئی شکایت نہیں!"

"پارٹی میں لطف آرہا ہے۔"

"سنو ـــــ ایک اچھی بات سناؤں۔"

"وہ کیا ہے؟" شہزاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نے انگڑائی لی

"مجھے ڈانس کرنے کا بہت شوق ہے ـــــ اس لئے جس پارٹی میں جاتا ہوں، ڈانس کرنے لگتا ہوں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی بیئر کا گلاس چھوڑ کر جاتا ہوں واپسی پر وہ خالی ہوتا ہے۔"

"یہ تو عجیب بات ہے!"

"آخر آج میں نے ایک ترکیب سوچی ـــــ ڈانس کرنے سے پہلے میں نے ایک کاغذ نکالا اور اس پر میں نے "اس میں تھوکا ہے" لکھ کر گلاس کے نیچے رکھ دیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ اسے کوئی نہ چھوئے گا۔ لیکن جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ نکلا۔

"کیا۔؟" شہزاد بھی متجسس تھا۔

"واپس آیا تو دیکھا کہ کسی نے کاغذ پر لکھ دیا تھا ـــــ "میں نے بھی اس میں تھوکا ہے ـــــ!"

دونوں کافی دیر تک ہنستے رہے۔

جانسن چلا گیا تو شہزاد پھر خاموش اور سنجیدہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شہزاد کو دو آدمی ملے وہ ایمفیٹامین بیچ رہے تھے ـــــ شہزاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اس کے پاس چالیس ڈالر تھے۔ اس نے دو انجکشن خرید لئے۔

آٹھ بجے تک شہزاد کی حالت خراب ہو چکی تھی ـــــ سلیم اسے ہسپتال چھوڑ آیا ـــــ کار سے نکلنے سے پہلے شہزاد نے کہا۔

"سلیم! ایک بات بتاؤ۔"

"وہ کیا؟" سلیم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

شہزاد نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ـــ

"ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں"

"غالب کی روح سے پوچھو!" سلیم نے جواب میں کہا اور شہزاد کو ہسپتال کے دروازے پر اتار کر چلا گیا۔

نرسوں نے پہلی دفعہ شہزاد کو لڑکھڑاتے دیکھا تو وہ سمجھ گئیں کہ وہ بہت زیادہ پی کر آیا ہے ـــــ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔

نرس اسے اس کے بستر تک لے گئی ـــــ شہزاد بستر پر گرا اور سو گیا ـــ اگلے دن جاگا تو اس کا نشہ اُتر چکا تھا۔

وہ ہسپتال سے نکلا تو بے بی سٹر سے ایڈم کو اٹھا کر گھر لے گیا اور کافی دیر تک ـــ کھیلتا رہا۔ اسے پچھلی شام کی باتیں بار بار یاد آ رہی تھیں۔

وہ ایڈم سے کھیلتے کھیلتے غسل خانے میں آیا، اس نے ایڈم کو چوما اور ....

"بیٹا! تم میری زندگی ہو، میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔" کہہ کر جیب سے ایمفیٹامین کے انجکشن نکال کر سنک میں بہا دیئے اور ایڈم کو گلے سے لگا لیا۔

ایڈم باپ کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

شہزاد اپنے بستر کے قریب کھڑا اپنے سُوٹ کیس میں میلے کپڑے ڈال رہا تھا تاکہ گھر جا کر دھوئے اور استری کرے کہ اتنے میں ایک نرس نے اسے بتایا کہ کسی ہسپتال کے ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ سے اس کے لئے فون آیا ہے!

وہ بھاگا بھاگا فون تک گیا۔

"کیا آپ شہزاد ملک ہیں ـــــ" کوئی نرس بول رہی تھی۔

"جی ہاں!" شہزاد کا سانس پھُولا ہُوا تھا۔

"کیا آپ جیولی آرنلڈ کو جانتے ہیں۔؟"

"بہت اچھی طرح!"

"آپ جلد تشریف لے آئیں ـــــ جیولی آرنلڈ ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں کوما COMA کی حالت میں پڑی ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا۔؟"

"آپ آئیں گے تو تفصیلات پتہ چل جائیں گی!"

شہزاد نے سُوٹ کیس کو وہیں چھوڑا اور بھاگا ـــــ اس نے ایک ٹیکسی لی اور اسے
سپتال کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

وُہ جانتا تھا کہ جیولی پچھلے دو ہفتوں سے بہت اکھڑی اکھڑی سی رہتی تھی ـــــ ایسا
تا تھا کہ اس کی شگفتگی اور شادابی کو جو بجھ کر رہ گئی تھیں۔ جیولی بھی ناخوش تھی، وہ بھی
خوش، حالات بھی ناگفتہ بہ تھے اور ایڈم کی طبیعت بھی خراب تھی۔

پچھلے ہفتے پہلی دفعہ دونوں میں تلخ کلامی ہُوئی تھی ـــــ شہزاد کو لگ رہا تھا کہ وہ
سے کچھ چھپا رہی ہے۔ آخر ایک موقع پر تنگ آ کر اس نے غصّے میں کہا تھا۔ "یہ کیا بکواس
ار کھی ہے تحمّل کر بات کیوں نہیں کرتیں؟"

پھر کیا تھا، جیولی بھی پھٹ پڑی۔

"بکواس میں کرتی ہوں یا تم ـــــ چلے آتے ہیں حضور کھانا کھانے، یہ گھر ہے یا سرائے،
یرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ میں اس طرح مزید زندگی نہیں گزار سکتی ـــــ گھر کا
م بھی کروں، ملازمت بھی کروں، ایڈم کی بیماری کا خیال بھی رکھوں اور اوپر سے تمہاری
یں بھی سُنوں ـــــ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں تمہاری صحیح معنوں میں شریکِ زندگی
ں ـــــ تمہارے بیٹے کی ماں ہُوں ـــــ تم نے مجھے بہت دُکھ دیئے ہیں ـــــ نہ تو میرے
شتہ دار مجھ سے سیدھے منہ بات کرتے ہیں اور نہ ہی میرے دوست ـــــ سب کہتے ہیں کہ
عادی مجرم سے رشتہ جوڑ لیا ہے ـــــ دوست احباب بھی کتراتے ہیں، کہتے ہیں کہ
پاگل کو گلے کا ہار بنا لیا ہے ـــــ میں اب تک تمہیں برداشت کر رہی تھی لیکن اب
رے بس کی بات نہیں رہی۔
رائل کالج کا نتیجہ بھی کسی دن آنے والا ہے ـــــ اگر فیصلہ میرے حق میں نہ ہوا تو تنہا جی
ا کروں گی ـــــ یہ پُورے شہر کیا پُورے ملک میں ذلیل و بدنام ہو جاؤں گی اور حضور ہیں کہ سکون
ے ہسپتال میں رہتے ہیں۔"

شہزاد کے بھی آبلے پھُوٹ پڑے تھے۔

"یہ سب جھوٹ ہے، الزام تراشی ہے، بہتان ہے ـــــ میں بھی اس زندگی سے تنگ

آ چکا ہوں ـــــ مجھے ہسپتال سے نفرت ہے لیکن بے بس اور مجبور ہُوں ـــــ مجھے پاگل خانے
نفرت ہے لیکن میں پابہ زنجیر ہُوں ـــــ نہ جانے کب تک قربانی کا بکرا بنا رہوں گا ـــــ اس
تو جیل بہتر ہوتی، معلوم تو ہوتا کہ کب آزاد ہو جاؤں گا ـــــ میں خود بھی اس زندگی سے بیزار
ہو چکا ہوں۔"

شہزاد ہسپتال پہنچا تو کیا دیکھتا ہے جیولی حیات و موت کی کشمکش میں تھی ۔ وہ
ے ذاتی کمرے میں بے ہوش پائی گئی تھی ــــ شاید اس نے بہت سی نشہ آور ادویا کھا
تھیں ــــ شاید اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی ــــ شہزاد حیران و پریشان تھا ۔
ر اس نے جیولی کا پرس دیکھا تو اسے ایک خط ملا جو رائل کالج کی طرف سے نوشتہ تھا ــــ

محترمہ جیولی آرنلڈ!

بڑے دکھ سے آپ کو یہ خبر دے رہے ہیں کہ رائل کالج کے شعبۂ اخلاقیات نے آپ کے خلاف فیصلہ دیا ہے ۔ رائل کالج کے قوانین اور روایات کے مطابق ہم آپ کو طب پریکٹس کرنے کی مزید اجازت نہیں دے سکتے اس لئے ہم آپ کا لائسنس کینسل CANCEL کرتے ہیں ۔

چیئرمین

شہزاد کافی دیر تک اس مختصر سے خط کو ہاتھ میں لئے خلاؤں میں گھورتا رہا ۔
تھوڑی دیر کے بعد نرس نے آکر خبر دی کہ ڈاکٹر اور نرسیں جیولی کی جان نہ
سکے ــــ وہ پھر بھی مبہوت کھڑا رہا ۔
شہزاد کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے قریبی ٹیلی فون سے ابراہیم کو نیوفن لی
فون کیا ۔

"ہیلو ابراہیم! ــــ میں شہزاد بول رہا ہوں اور بڑی مصیبت میں ہوں!"

"کیوں کیا ہوا؟"

"جیولی نے خودکشی کر لی ہے!"

"کیا حادثہ ہوا؟"

"رائل کالج نے اس کا لائسنس چھین لینے کا خط بھیجا تھا ــــ اس
پہلے کہ ہم اس سے بات کرتے وہ چل بسی ــــ شاید بہت سی نشہ آور گولیا
کھالی تھیں۔"

"اب تم کیا کرو گے؟"

"میں نہیں جانتا ــــ ! مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں چلڈرن ایڈز سوسا
CHILDREN AIDS SOCIETY میرے بیٹے ایڈم کو نہ لے جائے ــــ
میں ہسپتال میں ہوں اور پھر یہ کہ ہم نے قانونی طور پر شادی بھی نہیں کی تھی، اس
میں ایڈم کا قانونی طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا ۔ آپ کوئی مشورہ دیں ۔"

"دیکھو شہزاد ــــ ! مجھے تم پانچ منٹ کے بعد فون کرو، میں ذرا سوچ لو
اور ایک دوست سے مشورہ بھی کر لوں!"

چند منٹوں کے بعد جب شہزاد نے دوبارہ فون کیا تو ابراہیم کہنے لگا

"تم ایڈم کو لے کر فوراً نیوفن لینڈ چلے آؤ!"

"پولیس میری تلاش میں نکلے گی!"

"وہ صرف ٹورانٹو کے گرد و نواح میں تلاش کریں گے ــــ یہاں تک نہ آسک

یہاں ہم تمہیں چھپا کر رکھیں گے۔"

"آخر کب تک۔؟"

"جب تک ممکن ہو سکے ——— بیٹے کے ساتھ تو رہو گے نا۔"

"کب آؤں۔؟"

"جتنی جلدی ہو سکے ——— اگلی پرواز سے آجاؤ ——— لیکن خیال رکھنا کہ ٹکٹ اپنے نام پر نہ لینا ورنہ پکڑے جاؤ گے۔"

"اچھا ——— میں کوشش کرتا ہوں۔"

"میں منتظر رہوں گا۔"

شہزاد نے واپس جا کر سوٹ کیس میں میلے ہی نہیں اُجلے کپڑے بھی ڈالے ——— بے بی سٹر سے ایڈم کو اُٹھایا ——— گھر سے کچھ سامان لیا اور اگلی پرواز سے نیوفن لینڈ چل دیا۔

نرسوں نے ڈاکٹر شلٹز کو ——— ڈاکٹر شلٹز نے ایڈمنسٹریٹر کو ——— اد
ایڈمنسٹریٹر نے ریویو بورڈ کے چیئرمین کو شہزاد ملک کے غائب ہونے کی خبر دی۔

اگلی ریویو بورڈ کی میٹنگ میں ڈاکٹر شلٹز نے بتایا کہ شہزاد کی حالت بہت
تھی، وہ کافی ذمہ داری سے دن رات گزار رہا تھا کہ اچانک ایک دن غائب ہو گیا
بعد میں معلوم ہوا کہ اسی دن اس کی محبوبہ نے خودکشی کر لی تھی اور اس کا بیٹا بھی
غائب تھا۔

ایڈمنسٹریٹر نے بتایا کہ پولیس کو اطلاع دی گئی تھی لیکن وہ اسے تلاش نہ
کر پائے تھے۔

جج نے کہا کہ معاملہ بہت ہی سنجیدہ ہے ——— ایک ایسا قاتل جو دیوانہ بھی ہے
معاشرے میں بے لگام پھر رہا ہے ——— اس نے حکم دیا کہ مُلک بھر کی پولیس کو اطلاع
دی جائے اور وہ جب بھی ملے اسے واپس ہسپتال میں داخل کیا جائے۔

رہیئے اَب ایسی جگہ چَل کر جہاں کوئی نہ ہو

کئی مہینوں کے بعد سلیم کو شہزاد کا غیر متوقع خط ملا۔

پیارے دوست سلیم!

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ایک دروازہ بند ہُوا، پھر دُوسرا، پھر تیسرا، حتیٰ کہ میں تنہائیوں کی تاریک کوٹھری میں پہنچ گیا — وہاں یا میں تھا یا میرا بیٹا — پھر کیا تھا یا تو میں وہاں گھٹ گھٹ کے مرجاتا اور یا گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ آزمائش کی گھڑیوں میں کیا کیا رسک RISK لینے پڑتے ہیں۔

شہر ٹورانٹو سے میرے غائب ہونے کا قصہ طویل قصہ ہے۔ بیوی نے خودکشی کر لی، میں ہسپتال میں محصور تھا اور مجھے ایڈم کی فکر تھی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں مفرور ہو جاؤں — تم پوچھو گے کہ

rekhta

کئی مہینوں کے بعد سلیم کو شہزاد کا غیر متوقع خط ملا۔

پیارے دوست سلیم!

نکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ایک دروازہ بند ہُوا، پھر دُوسرا، پھر تیسرا، حتیٰ کہ میں تنہائیوں کی تاریک کوٹھری میں پہنچ گیا — وہاں یا میں تھا یا میرا بیٹا — پھر کیا تھا یا تو میں وہاں گھٹ گھٹ کے مرجاتا اور یا گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ آزمائش کی گھڑیوں میں کبھی کبھار رسک RISK لینے پڑتے ہیں۔

شہناز کے مرنے اور میرے غائب ہونے کا قصّہ طویل قصہ ہے، جولی نے خودکشی کرلی، میں ہسپتال میں محصور تھا اور مجھے ایڈم کی فکر تھی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں مفرور ہو جاؤں — تم پُوچھو گے کہ

میں کہاں ہُوں، بقول غالبؔ ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

سلیم — تم سے بھلا کیا چھپانا، یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر پکڑا گیا تو یا جیل میں ڈال دیا جاؤں گا یا کسی پاگل خانے کے تاریک کمرے میں — میرا ایک دوست نیوفن لینڈ کا تھا، اس کا مشورہ تھا کہ میں نیوفن لینڈ میں روپوش ہو جاؤں — چنانچہ میں ایڈم کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آگیا ہوں، سینٹ جانز میں ابراہیم کے ساتھ رہتا ہُوں. بڑی خاموشی سے دن گزر رہے ہیں.

دوست —!

میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ میری زندگی اتنی پیچیدہ کیوں ہے — میرے والدین حالات سے مجبور ہو کر اور مجھے چھوڑ کر پاکستان چلے گئے — میرے بیٹے کا نام تک نہیں سُننا چاہتے — کہتے ہیں حرامی بچہ ہے — پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے — ایک معصوم بچّے کی نگہداشت میں کر رہا ہوں اور کسی کو اُتہ پتہ بتانے سے گھبراتا ہُوں۔ المختصر ؎

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سلیم — تم واحد دوست ہو جس کو میں غالبؔ کے اشعار اور باتیں اور معنی بے معنی قصّے سُنا سکتا ہُوں — غالبؔ کے اشعار دن رات پڑھتا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ وہ شخص کتنا روایت شکن اور خوددار تھا۔ وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھا اور جب انسان اپنے وقت سے آگے ہو تو تنہا رہ جاتا ہے۔

میں کہاں ہوں، بقول غالب ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

سلیم — اتم سے سنبھلا کیا چھپانا، یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر پکڑا گیا تو یا جیل میں ڈال دیا جاؤں گا یا کسی پاگل خانے کے تاریک کمرے میں — میرا ایک دوست نیوفن لینڈ کا تھا، اس کا مشورہ تھا کہ میں نیوفن لینڈ میں روپوش ہو جاؤں — چنانچہ میں ایڈم کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آگیا ہوں، سینٹ جانز میں ابراہیم کے ساتھ رہتا ہوں۔ بڑی خاموشی سے دن گزر رہے ہیں۔

دوست — !

میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ میری زندگی اتنی پیچیدہ کیوں ہے — ہو والدین حالات سے مجبور ہو کر اور مجھے چھوڑ کر پاکستان چلے گئے — میرے بیٹے کا نام تک نہیں سننا چاہتے — کہتے ہیں حرامی بچہ ہے — پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے — ایک معصوم بچے کی نگہداشت میں کر رہا ہوں اور کسی کو اتہ پتہ بتانے سے گھبراتا ہوں۔ المختصر ؎

زندگی اپنی جب اس طور سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

سلیم — اتم واحد دوست ہو جس کو میں غالب کے اشعار اور باتیں اور معنی بے معنی قصے سنا سکتا ہوں — غالب کے اشعار دن رات پڑھتا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ وہ شخص کتنا روایت شکن اور خوددار تھا۔ وہ اپنے وقت سے بہت آگے تھا اور جب انسان اپنے وقت سے آگے ہو تو تنہا رہ جاتا ہے۔

اسی لئے اس نے اپنے ہمعصروں سے کہا تھا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اگر میں غالب کے زمانے میں ہوتا تو ضرور اس کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتا۔

ریچل کا حال میری طرف سے پوچھنا۔

خط پڑھ کر جلا دینا تاکہ کسی کو خبر نہ ہو اور اگر کبھی خط لکھنا تو ابراہیم کے نام پر —

تمہارا۔
شہزاد ملک

ایک دن ریچل نے اپنا لیٹر بکس کھولا تو ایک پیارا سا لفافہ گر پڑا۔ اس نے اٹھایا، دیکھا اور چھلانگ لگائی ــــ اس نے شہزادی کی تحریر پہچان لی تھی ــــ وہ کمرے میں واپس آئی، روکنگ چیئر ROLKING CHAIR پر دراز ہوئی، میز پر پاؤں پسارے اور بڑے اطمینان سے خط پڑھنے لگی۔

پیاری دوست ریچل!

آج نیو فن لینڈ کی سرد فضا میں تمھاری یاد کا گرم جھونکا آیا، تو میں نے قلم اُٹھایا۔ تم سے ملاقات ہوئے عرصہ بیت گیا ہے!

کتنی شمعیں ہیں جو شام ہوتے ہی جلنی شروع ہوجاتی ہیں اور صبح ہونے تک جلتی رہتی ہیں ــــ سینٹ جانز میں آنے کے بعد پہلے چند ہفتے تو بہت پریشانی کے تھے ــــ میں دن رات چھپا رہتا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے، پولیس کو خبر نہ دے اور مجھے دوبارہ نہ دھر لیا جائے ــــ ایڈم کے لئے چار دیواری میں رہنا مشکل تھا کیوں کہ وہ کھلی فضا کا عادی تھا لیکن آہستہ آہستہ حالات

معمول پر آگئے ہیں۔

ابراہیم، میرا دوست، میرا بزرگ، میرا کرم فرما۔ انسان کی شکل میں فرشتہ ہے ــــ اس کی واٹر سٹریٹ پر ایک بلڈنگ ہے جس کی تین منزلیں ہیں ــــ نیچے رستوران ہے، درمیانی منزل میں خود اس کی رہائش ہے اور سب سے اُوپر والی منزل ہمارے لئے ہے۔

رستوران بڑے مزے کا ہے، اس میں مچھلی، جھینگے، لابسٹر LOBSTER سبھی سمندر کے من بھاتے کھاجے مہیا ہوتے ہیں، رستوران کا نام نوح کی کشتی NOAH'S ARK ہے۔ نیوفن لینڈ کے باسی مچھلی اور سی فوڈ SEA FOOD کے عاشق ہیں، اس لئے رستوران میں گھما گھمی رہتی ہے۔

پہلے تو ابراہیم کے ساتھ ایک اور رفیق کار کام کرتا تھا لیکن جب میں نے ہر قسم کے کھانے پکانے سیکھ لئے اور وہ شادی کے بعد کسی اور شہر میں چلا گیا تو میں نے باورچی خانے کی ذمہ داری سنبھال لی۔ میں باورچی خانے میں کام کرتا ہوں اور ابراہیم گاہکوں کا خیال رکھتا ہے میں نے داڑھی بھی بڑھالی ہے اسلئے اگر کوئی دیکھ بھی لے تو پہچان نہ پائے گا۔

ریچل! میری زندگی جو ہمیشہ انتشار کا شکار تھی، اب پُرسکون ہوگئی ہے ــــ تم تو جانتی ہو میں ساری عمر لڑتا رہا ہوں ــــ اپنے ماحول سے، خاندان سے، دوستوں سے، خدا سے، ہر کسی سے لیکن اب زندگی میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا ہے۔

میرا صبح اُٹھنا، ایڈم کو جگانا، اسے تیار کرکے اسکول چھوڑ کے آنا، دن بھر کام کرنا، سہ پہر کو اسے واپس لانا اور شام کو ہم سب کا

مل کر ایک خاندان کی طرح وقت گزارنا میری زندگی کا ایک حسین انقلاب ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میں اپنے بیٹے کی کتنی خوش اسلوبی سے تربیت کر رہا ہوں ۔۔۔ میں اس کے لئے انگریزی، فرنچ اور اُردو تینوں زبانیں سیکھنے کا بندوبست کر رہا ہوں۔ بہت ذہین بچہ ہے ۔۔۔ بچّے ہمیں کتنا بدل دیتے ہیں ۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

تمھارے بیٹے ڈیوڈ کا کیا حال ہے ۔۔۔ وہ اب تو جوان ہو گیا ہو گا ۔۔۔؟

میں اب جب اپنے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔

میں تم سے مزید باتیں کرتا لیکن ایڈم چاہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ کھیلوں، اس لئے اجازت چاہتا ہوں۔

تمھارا دوست

شہزاد

کتنے چاند آئے اور گزر گئے۔
کتنے سُورج طلوع ہُوئے اور غروب ہو گئے۔

ایڈم، ابراہیم اور شہزاد سینٹ جانز میں مسرور خاندان کی طرح رہ رہے تھے ایڈم اسکول میں پڑھتا رہا، ابراہیم اور شہزاد ریستوران میں کام کرتے رہے اور ایڈم کی پرورش کرتے رہے جو مقامی ماحول اور اسکول سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ اسے ابراہیم کے ساتھ کشتی کی سواری کا بہت لطف آتا۔

ایک شام موسم بہت خوش گوار تھا اور چودھویں رات کا چاند آسمان کے سمندر میں تیر رہا تھا ۔۔۔ ایڈم نے خواہش کا اظہار کیا تو ابراہیم نے کشتی نکالی، تینوں سیر کے لئے نکل پڑے۔

ابراہیم نے کشتی کو پانی میں ڈال کر چپّو چلانے شروع کئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنے سفید بالوں کو جھٹکتے ہُوئے کہا۔

"اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں شہزاد! میری مدد کرو!"

شہزادے نے بھی چپو چلانے شروع کئے۔ پھر وہ ایڈم کو دیکھ کر مخاطب ہوا
ایڈم ___ اب تو تم بھی جوان ہو رہے ہو، چپو چلانا سیکھو تاکہ کل کو جب تمہارا باپ
بھی بوڑھا ہو جائے تو تم اس کا ہاتھ بٹا سکو۔

ضرور ڈیڈی!

جب کشتی ساحل سے کافی دور چلی گئی تو وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

شہزادہ بولا ___ ابراہیم! ہماری ملاقات کو کئی سال بیت گئے ___ اب ہم دوست
بن گئے ہیں، پہلے تم میرے دوست تھے، میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا ہے ___
یہ علیحدہ بات ہے کہ میرے دل میں بہت سے سوال شروع سے ہی جواب سے تشنہ
رہے ہیں!

پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ابراہیم مسکرایا!

"جب ٹورانٹو میں میری تم سے ملاقات ہوئی تھی، میں تمہارے لئے اجنبی تھا۔
ہم میں کوئی رشتہ نہ تھا اس کے باوجود تم مجھ پر بہت مہربان تھے"

"یہ بھلا کیا بات کہ ہم میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ رشتے صرف خون کے ہی نہیں انسانیت
کے بھی ہوتے ہیں!"

ایڈم پانی میں چاند کا عکس دیکھتے ہوئے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

لیکن اس وقت میں ایک مجرم تھا، گنہگار، لوگوں کی نگاہوں میں ملعون اور
قانون کی نگاہوں میں پاپی لیکن تم نے کبھی مجھے اس کا احساس نہ ہونے دیا!"

شہزاد ___ دنیا میں کوئی شخص بھی گنہگار و مجرم پیدا نہیں ہوتا ___ سب
بچے معصوم پیدا ہوتے ہیں ___ لیکن جوں جوں وہ جوان ہوتے ہیں ماحول کی کثافتیں
ان کی شخصیت میں جذب ہو جاتی ہیں اور جب کثافتوں کی مقدار حد سے بڑھ جاتی ہے تو
اس کے رنگ، بو، عادات و خصائل میں تبدیلی آ جاتی ہے اور انسان ایسی حرکتیں کرنے
لگتا ہے جسے لوگ گناہ اور جرم کا نام دے دیتے ہیں ___ یہ ٹوٹے ہوئے
انسانوں کی نشانی ہے!

ٹوٹے ہوئے انسان ___ میں سمجھا نہیں!

"ایک وہ دور تھا جب انسان اپنے ماحول سے، کائنات سے، دوسرے انسانوں سے
اور اپنی ذات سے جڑا ہوا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ ان سے ٹوٹتا جا رہا ہے اسلئے
اس میں اس قدر غصہ اور نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور محبت، خلوص اور پیا
کے جذبات کا فقدان ہونے لگتا ہے۔

میں جب تم سے ملا تو تم بھی اسی کشتی میں سوار تھے ___ میری خواہش تھی
تم اپنی ذات سے جڑ جاؤ ___!

"میری زندگی جہنم کی طرح تھی، تم مجھے جنت میں لے آئے۔ لیکن یہ تو تم نے مجھے
اور میرے بیٹے ایڈم کو اتنا طویل عرصہ سہارا کیوں دیا ___ ؟ ہمیں رہنے کو جگہ د
ہماری حفاظت کی، کھلایا، پلایا اور اپنے اتنے قریب رکھا ___!

"یہی تو جنت اور جہنم کا فرق ہے"

"وہ کیا؟"

اتنے میں ایک زور کی لہر آئی اور کچھ پانی کشتی میں آ گیا ___ ایڈم نے
خوشی سے چیخ ماری ___ وہ باتیں بھی سن رہا تھا اور مچھلیاں بھی دیکھ رہا تھا

"میں تمہیں ایک یہودی کہاوت سناتا ہوں تاکہ تمہیں جنت اور جہنم کے فرق
پتہ چل سکے۔

ایک دفعہ ایک یہودی ربائی RABBI خدا کے پاس گیا اور کہنے لگا ___ "میں
دن رات لوگوں کو جہنم کی باتیں سناتا رہتا ہوں، آج میں اپنی آنکھوں سے جہنم
دیکھنا چاہتا ہوں"۔

خدا نے بائیں طرف کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جا
اس کمرے میں"

وہ ربائی اس کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بہت بڑا برتن ہے
جس میں انواع و اقسام کے کھانے موجود ہیں ___ اس کے چاروں طرف بیسیوں

مرد اور عورتیں بیٹھے ہیں، وہ سب کمزور، نحیف و ناتواں، رنجیدہ و پریشاں نظر آ رہے ہیں اور مصیبت میں آہ و زاری کر رہے ہیں، غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان کے پاس ایک ایک چمچ ہے، لیکن وہ اتنا لمبا ہے کہ وہ چمچ کو اپنے منھ میں نہیں ڈال سکتے اس لئے کھانا ہونے کے باوجود نہیں کھا سکتے۔

ربیائی واپس لوٹا تو کہنے لگا۔

"خدایا —! میں اپنے لوگوں کو جنّت کے بھی بہت سے قصّے سُناتا رہتا ہوں، اسے بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خدا نے اسے دائیں طرف کے کمرے میں بھیج دیا — وہ کمرہ بھی پہلے کمرے کی طرح تھا — اسی طرح کے لوگ — اسی طرح کا برتن اور اسی طرح کے چمچ — لیکن یہاں سب کی سب خوش، ہشّاش بشّاش، ہنستے، تندرست و توانا نظر آ رہے تھے — وہ بہت حیران ہُوا۔

غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ان لوگوں نے اپنے اپنے چمچ سے اپنے سامنے والے شخص کو کھانا کھلانا سیکھ لیا تھا — ربیائی خدا کا اشارہ سمجھ گیا۔

زندگی میں دو طرح کی طاقتیں ہیں — بعض انسانوں کو اپنی ذات، دوسرے انسانوں اور کائنات سے کاٹ دیتی ہیں اور زندگی کو جہنّم بنا دیتی ہیں اور بعض ان سب کو آپس میں ملا کر زندگی کو جنّت بنا دیتی ہیں۔ دُنیا میں ہمیشہ سے پیغمبر انسانوں کو جوڑنے ہی کو آتے رہے ہیں۔"

ابراہیم —! تم بہت دانا ہو — میں تمھارا مشکور ہوں — تم نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔"

"کوئی شخص کسی کی زندگی نہیں بدلتا — ہم سب کی ابتداء و انتہا ایک ہی ہے — میں بھی ایک زمانے میں جیل میں پندرہ سال رہ کر آیا تھا — میں بھی بہت شراب پیا کرتا تھا — نیوفن لینڈ کی سکریچ SCREECH میری محبوب شراب تھی —

شراب کے نشے میں بیوی کو مارا پیٹا کرتا تھا اور کار چلانے میں بد احتیاطی کرتا تھا — میں نے اتنے جرائم کئے کہ مجھے جیل بھیج دیا گیا — لیکن اب حالات مختلف ہیں — میں جانتا تھا کہ تم کن راستوں سے گزر رہے تھے۔"

ابراہیم اور شہزاد نے ایک دوسرے کو بڑے جوش سے گلے لگایا جس میں عقیدت بھی تھی اور محبت تھی۔

اتنے میں ایڈم شہزاد کے قریب آیا اور بولا۔

"ڈیڈی! ایک بات پُوچھوں۔؟"

"پُوچھو بیٹا —!"

شہزاد لفظ "بیٹا" کہتے ہوئے کتنا فخر محسوس کرتا تھا۔

"میں انگریزی اور فرنچ کا تو ماہر ہوں لیکن آپ مجھے اُردو کیوں سکھا رہے ہیں۔؟"

ایڈم نے پُوچھا۔

"تاکہ تم دیوانِ غالب پڑھ اور سمجھ سکو!"

"پھر کیا ہوگا —؟" ایڈم اب قدرے تنگ مزاج بھی ہو گیا تھا۔

"تم مشرقی اَدب اور ثقافت سیکھ جاؤ گے!"

"لیکن مجھے مشرقی تہذیب سے کیا لینا دینا —؟"

"بیٹا! ایسی باتیں نہ کرو — میرا دل نہ توڑو —!"

"ڈیڈی آپ تو ناراض ہی ہو گئے ہیں — اچھا میں آپ کو غالب کا ایک شعر سُناتا ہوں پھر آپ ایک شعر سنائیں!"

"ضرور — تو سُناؤ۔؟"

"جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی"

"اب آپ کوئی شعر سُنائیں —؟"

"ضرور سنو —

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہزاد اور ایڈم باتیں کر رہے تھے کہ ابراہیم نے کہا۔
"چلو بیٹو ——! واپس چلو، اب میں تھک گیا ہوں!"
اور وہ سب واپس چلے آئے ——
چاند بادلوں کے پیچھے چھپ رہا تھا ——

rekhta

rekhta

ٹورانٹو میں ہر سال ریویو بورڈ بیٹھتا۔
جج، وکیل، ڈاکٹر، ایڈمنسٹریٹر جمع ہوتے۔
ایڈمنسٹریٹر بتاتا کہ نہ تو ہسپتال والوں کو اور نہ ہی پولیس کو شہزاد ملک کی کوئی خبر ہے۔
آخر میں فیصلہ ہوتا کہ جب کبھی وہ ملے اسے دوبارہ ریویو بورڈ کے سامنے پیش کیا جائے۔ کیوں کہ وہ غیر قانونی طور پر لاپتہ ہے۔

چاروں طرف لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے ___ جمعہ کی شام کو اکثر پاپاز پلیس PAPPA'S PLACE ریستوران میں کافی چہل پہل رہتی تھی۔

اس دن ایڈم کی سالگرہ تھی، چودھویں سالگرہ ___ اس لئے باپ بیٹے دونوں بہت خوش تھے۔

ایڈم نے چاروں طرف دیکھا ___ دیواروں پر آئینے مزین تھے جس سے وہ ریستوران اپنے سائز سے بڑا لگ رہا تھا۔ ویٹر نے انہیں کرسیوں پر بٹھایا اور خود کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"ایڈم! جانتے ہو ___ اچھے ریستوران کی کیا نشانی ہے؟"

"اسکا کھانا ہی نہیں سروس بھی اچھی ہوتی ہے ___!"

"لیکن اگر تمہیں کھڑکی سے جھانک کر بتانا ہو کہ ریستوران کلاسی CLASSY ہے یا نہیں تو کیسے بتاؤ گے؟"

"پتہ نہیں ___ آپ بتائیں ___؟"

"کلاسی ریستوران کے نیپکن کاغذ کے نہیں کپڑے کے ہوتے ہیں!"

"آپ کیا نوش فرمائیں گے۔" ویٹر نے پوچھا۔

"ایک کوک!"

"ایک اورنج جوس!"

اس نے مینو MENU آگے بڑھا دیا۔

ایڈم وہاں پہلے نہ آیا تھا لیکن مینو MENU دیکھ کر جان گیا کہ ریستوران گریک GREEK تھا۔ اور ڈشز کے نام فلسفیوں کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔

شہزاد نے سوکراٹیز ڈنرز SOCRATES DINNER اور ایڈم نے پلیٹوز چوائس PLATO'S CHOICE کا آرڈر دیا۔

ویٹر مسکرایا۔ "کیا آپ باپ بیٹے ہیں۔؟"

"نہیں، دو بھائی ہیں!" شہزاد نے آنکھ ماری۔

ویٹر اس کا مزاح سمجھ گیا تھا۔

"امید ہے تم ہمیں سقراط کا زہر نہ پلاؤ گے!" ایڈم کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

"پیغمبری کے لئے یہ بہت ضروری ہے ___!" ویٹر بھی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہا تھا ___

ایڈم اور شہزاد خوب ہنسی مذاق کر رہے تھے لیکن چند لمحوں کے لئے ماحول سنجیدہ ہو گیا۔ ایڈم پوچھ رہا تھا۔

"ڈیڈی ___ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا کیا تھی۔؟"

"میں اپنے بیٹے کی اپنے ہاتھوں تربیت کر سکوں!"

"ڈیڈی ___ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ میری سالگرہ پر مجھے ممی کے بارے میں بتائیں گے؟"

"بیٹا ___ تمہاری ممی جولی ایک غیر معمولی عورت تھی ___ وہ مسیحا تھی مسیحا۔ اس نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب سب مجھے دھتکار چکے تھے ___ میں ایک عجب

تھا ـــ ایک پاپی تھا ـــ میری زندگی گناہوں سے پُر تھی ـــ اس نے مجھے خلوص دیا ـــ محبت دی ـــ لیکن اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑی ـــ میں اس کا مریض تھا ـــ جب سب نے مجھے ٹھوکریں ماریں تو اس نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا ـــ ہم اکٹھے رہنے لگے اور اس نے مجھے تم جیسا بیٹا دیا ـــ"

شہزاد نے گہری سانس لی اور فضا میں گھورنے لگا جیسے ماضی کے گم شدہ لمحوں کو چھونا چاہتا ہو۔

"لیکن پھر اس پر رائل کالج نے مقدمہ چلایا کہ وہ اپنے مریض کے ساتھ ملوث ہوگئی تھی۔ اسے اس بات کا بڑا دکھ ہوا، اور جب رائل کالج نے سزا کے طور پر اس کا لائسنس چھین لیا تو اس نے خودکشی کرلی۔"

دونوں چند لمحوں کے لئے خاموش ہوگئے، ایسی خاموشی جس میں اپنائیت اور دکھ کی شرکت کا احساس تھا۔

کھانے کے بعد ویٹر نے بکلاوے کی تجویز پیش کی اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ ایڈم کی سالگرہ تھی تو وہ خاص کیک لے کر آیا ـــ اور سب مہمانوں نے مل کر برتھ ڈے کا گانا گایا۔

دونوں گھر پہنچے تو ان کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔

پولیس ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔

"شہزاد ملک آپ کے لئے وارنٹ گرفتاری ہے ـــ آپ تقریباً بارہ سال پہلے ٹورانٹو سے فرار ہوئے تھے، ہمیں آپ کو واپس لے جانا ہے!"

ابراہیم نے کاروائی ملتوی کرانے کی لاکھ کوشش کی لیکن سب بے سود ـــ پولیس اسے اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔

ابراہیم اور ایڈم بہت پریشان تھے، لیکن شہزاد کے چہرے پر متانت اور سکون کے سائے لہرا رہے تھے ـــ اس نے ایک بیگ میں کپڑے ڈالے اور پولیس کے ساتھ ہو لیا۔

ابراہیم نے کہا کہ وہ اگلے دن ایڈم کو لے کر ٹورانٹو آجائے گا تاکہ مقدمے کی کاروائی سن سکیں ـــ

اس نے سلیم اور ریچل کو فون کیا تاکہ وہ کسی اچھے وکیل کا بندوبست کرسکیں۔

وہ سب حیران تھے کہ پولیس کو خبر کیسے ہوئی۔

وہی حکایتیں تھیں، وہی شکایتیں۔

وہی حق و انصاف کے سلسلے تھے اور وہی صبر و تحمل کے مرحلے۔

وہی شہزاد تھا، وہی ہسپتال۔

وہی ریویو بورڈ اور وہی خاموشی۔

ایسی خاموشی جو حاملہ تھی لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ اس دفعہ اس کی کوکھ سے گلاب کا پھول نمودار ہوگا یا سانپ۔

شہزاد کو احباب سے ملنے کے لئے چند منٹ ملے —— وہ کمرے سے باہر نکلا، تو ریچل، ڈیوڈ، سلیم، ابراہیم اور ایڈم کو دیکھ کر حیران ہوا —— وہ سب ایک دوسرے سے مدتوں سے نہ ملے تھے بلکہ ابراہیم سے تو وہ پہلی دفعہ مل رہے تھے —— وہ سب شہزاد کی وجہ سے یکجا ہوئے تھے۔

ان کے ہونٹوں پہ خاموشی اور آنکھوں میں انتظار تھا۔

شہزاد سب سے گلے ملا اور پھر مسکراتا ہوا واپس لوٹ آیا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز

ریویو بورڈ کی میٹنگ سارا دن جاری رہی ——— میز کے ایک طرف جج، وکیل، ماہر نفسیات اور ایڈمنسٹریٹر اور دوسری طرف شہزاد ملک، اس کا وکیل اور ماہر نفسیات بیٹھے تھے ——— انتظار گاہ میں سب دوست سراپا انتظار تھے۔

ایڈمنسٹریٹر نے بیان دیا۔

"شہزاد ملک اس ہسپتال سے کئی سال پیشتر بغیر بتلائے غائب ہو گیا تھا ——— ہم نے پولیس کو اطلاع دی لیکن کچھ خبر نہ ملی ——— کئی سال گزر گئے ——— پچھلے مہینے شہزاد کا ایک پرانا دوست ڈیرک ہسپتال میں داخل ہوا جو شہزاد کے ساتھ ایمفیٹامین AMPHETAMINE کا غیر قانونی کاروبار کیا کرتا تھا ——— وہ بہت بیمار تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ شہزاد سینٹ جانز نیوفن لینڈ میں ریستوران میں کام کرتا ہے چنانچہ پولیس کو اطلاع دی گئی اور وہ اسے واپس لے آئے ہیں۔"

وکیل کہنے لگا۔

"شہزاد ملک ایک مجرم ہے ——— اس نے قتل کیا تھا ——— وہ ذہنی طور پر بھی توازن کھو چکا تھا اس لئے جیل میں جانے کی بجائے ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا تاکہ اس کا علاج ہو سکے لیکن وہ مفرور ہو گیا ——— یہ ایک علیحدہ جرم ہے جس سے اس نے لیفٹیننٹ گورنر کے وارنٹ کی خلاف ورزی کی ——— اس پر اس حرکت کی وجہ سے بھی مقدمہ چلایا جا سکتا ہے!"

شہزاد چپ چاپ بیٹھا یہ سب کچھ سن رہا تھا ——— اس کی آنکھوں میں تحمل اور چہرے پر بردباری کا رنگ نمایاں تھا۔

شہزاد کے وکیل نے کہا۔

"حضرات! یہ بات بجا ہے کہ شہزاد اس ہسپتال سے چلا گیا تھا لیکن ہمیں حالات کا پوری طرح جائزہ لینا چاہیئے ——— شہزاد ذہنی طور پر تندرست ہو چکا تھا اور معاشرے میں ایک ذمہ دار شہری کی طرح زندگی گزارنا چاہتا تھا ——— اس کا ایک بیٹا ہے جس کی وہ خود پرورش کرنا چاہتا تھا ——— اس نے جب بھی شہر میں رہنے کی درخواست

کی اسے ریویو بورڈ نے مسترد کر دی۔ چنانچہ وہ جیولی کی وفات کے بعد اس بات پر مجبور ہو گیا کہ اپنی زندگی کے چند فیصلے وہ خود کرے۔

وہ برسوں سے نیوفن لینڈ میں رہ رہا ہے ——— بیٹے کی پرورش ——— ذمہ دار ملازمت، نہ کسی ہسپتال میں داخل ہونا نہ کسی جرم میں ملوث ہونا اس کا ایک ذمہ دار شہری ہونے کے کافی ثبوت ہیں ——— اس کا عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہ تو اب ذہنی مریض ہے اور نہ ہی مجرم، بلکہ ہسپتال کی فضا اس کی ذہنی صحت کو مجروح کر سکتی ہے ——— یہ بہت ہی ناانصافی ہو گی اگر ہم اسے ایک پرسکون، صحتمند اور خوش حال زندگی سے نکال کر ایک بیمار فضا میں بھیج دیں۔"

شہزاد ملک نے اپنے حق میں کچھ نہ کہنا ہی مناسب سمجھا۔

طویل کارروائی کے بعد جج نے فیصلہ سنایا۔

"حضرات! ہم نے شہزاد ملک کے جرائم، اس کے فرار، اس کی گرفتاری، اور طرز زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ شہزاد ملک نیوفن لینڈ میں ایک ذمہ دار زندگی گزار رہا تھا لیکن ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ ذہنی طور پر صحتمند ہو چکا ہے یا نہیں ——— اس لئے ہم اسے تین مہینوں کے لئے دوبارہ میکسیمم سکیورٹی ——— MAXIMUM SECURITY کے ہسپتال میں داخل کریں گے تاکہ اس کی ذہنی صحت کا ازسرنو معائنہ کیا جا سکے کہ اسے ہسپتال میں رہنا چاہیئے یا اسے آزاد کر دینا چاہیئے۔"

شہزاد ملک کا وکیل احتجاجاً پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا ——— اس سے پہلے کہ پولیس اور نرسیں اسے دور ہسپتال منتقل کرتے، اسے چند لمحوں کے لئے دوستوں سے ملنے کی اجازت ملی۔

وہ ابراہیم سے گلے ملا ——— ابراہیم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ریچل اتنی غمگین تھی کہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس نے ایڈم کو گلے سے لگایا۔

"ڈیڈی یہ ناانصافی ہے!"

"بیٹا ——— یہ مصیبتیں عارضی ہیں!"

"لیکن ڈیڈی آپ مسکرا کیوں رہے ہیں۔؟"

"اس لئے بیٹا کہ میں اس دفعہ مصیبت میں گرفتار ہوں مصیبت میں نہیں!"

آخر میں اس نے سلیم کو گلے لگایا ___ سلیم غصے میں تھا۔

"یہ ڈیرک ذلیل خود بھی ڈوبا اور تمہیں بھی ڈبو دیا ___"

"کوئی بات نہیں ___ زندگی میں اچھے موسم بھی آتے ہیں اور بُرے بھی۔"

شہزاد نے بیگ اٹھایا اور آہستہ آہستہ پولیس کے ساتھ چل دیا۔ سب لوگ اسے حسرت، دکھ اور پیار کی نظروں سے دیکھتے رہے ___ انہیں امید تھی کہ یہ المیہ صرف تین مہینے کے لئے ہی ہوگا ___

لیکن پھر ___ مستقبل کی کس کو خبر ___

جون ۱۹۸۸ء

ناولٹ

مقدس جیل

خالد سہیل

اپریل ۱۹۸۷ء

میں اپنے بستر میں لیٹی نہ جانے کب سے کروٹیں بدل رہی ہوں۔

میرے پیٹ میں درد کی لہریں اُبھرتی اور ڈوب جاتی ہیں۔

مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ غسل خانے میں جاکر کپڑے بدل لوں ــــ اور ٹیمپون استعمال کرسکوں۔

میرے پاس درد کی گولیاں بھی تو نہیں۔

مجھے سعودی عرب آئے اور ہسپتال میں کام کرتے دو ہفتے ہو گئے ہیں لیکن نہ کوئی دوست، نہ آشنا، نہ ساتھی نہ ہمدرد ــــ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے اور میں ہوں ــــ وہ بھی جیل کا کمرہ لگتا ہے ــــ نیچی چھت، ایک بستر، ایک میز اور ایک چھوٹی سی الماری ــــ میرے کمرے کے ایک طرف میرے کپڑے ہیں اور دوسری طرف میری کتابیں ــــ نہ ٹی وی ہے نہ ریڈیو، نہ ذاتی ٹیلی فون ــــ ایک چھوٹی سی گھڑی ہے جو میں اپنے ساتھ کنیڈا سے لائی ہوں اور جس کی ٹک ٹک اس وقت ہتھوڑے بن کر میرے ذہن پر برس رہی ہے۔

عورتوں

کے

نام

اس بلڈنگ میں ایسے اور بھی بیسیوں کمرے ہیں جن میں ہسپتال میں کام کرنے والی عورتیں رہ رہی ہیں لیکن میری کسی سے واقفیت نہیں۔

میں بڑی مشکل سے اٹھ کر غسل خانے جاتی ہوں، پانی کا گلاس پیتی ہوں لیکن نقاہت بڑھتی جاتی ہے ـــــ پیٹ میں درد کی ایک لہر ابھرتی ہے ـــــ میں دروازے کو تھام لیتی ہوں کہ کہیں زمین پر گر نہ جاؤں۔

میں بے ہوش ہو کر گر پڑی تو کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔ میں مر بھی گئی تو کسی کو معلوم ہوگا۔ مجھے دفن کر دیں گے اور میرے گھر والوں کو اطلاع بھی نہ ملے گی۔ میں کمرے سے نکلی تاکہ ساتھ والے کمرے کی اجنبی عورت سے کہوں مجھے ہسپتال لے جاؤ ـــــ لیکن پھر خیال آیا ـــــ رات کے تین بجے ہیں، اس وقت کسی کو بے آرام کرنا ٹھیک نہیں۔ میں نے اس کے دروازے پر ہاتھ رکھا لیکن کھٹکھٹایا نہیں ـــــ چند لمحے کھڑی رہی ـــــ میری طبیعت قدرے سنبھل گئی اور میں واپس آکر بستر پر دوبارہ لیٹ گئی۔

میں قدرے سہم سی گئی تھی ـــــ

مجھے کس کالے کتے نے کاٹا تھا کہ میں سعودی عرب آئی۔

تنہا ہوں اور تاریکیوں کے زنداں میں روشنی اور دوستی کی پہلی کرن واسں ہوں

کیفی ٹیریا میں اتفاقاً ملاقات ایک انگلینڈ کی نرس سے ہو گئی۔

"میرا نام ورانیکا ہے۔ میں تین ہفتے پہلے کنیڈا سے آئی ہوں۔ وارڈ نمبر ۲ میں بطو

نرس کام کر رہی ہوں!" میں نے تعارف کرایا۔

میرا نام مارگریٹ ہے، میں وارڈ نمبر ۹ میں نرس ہوں، مجھے پانچ ہفتے ہو گئے ہیں۔

میں اپنے کمرے سے بہت تنگ آگئی ہوں، مجھے گھٹن ہوتی ہے!"

"میرا بھی یہی حال ہے!"

"یہاں دو نرسوں کے لئے بھی کمرے ہیں، سنا ہے ہوادار اور کشادہ ہیں، اگر چاہو تو

دیکھ آئیں۔"

"یہ تو بہت عمدہ مشورہ ہے!"

چنانچہ ہم چھٹی ہوتے ہی وہ کمرے دیکھنے گئے ـــــ وہ واقعی بڑے تھے ـــــ

الماریاں بھی بہتر تھیں اور بستر بھی چوڑے ۔۔۔ کمرے میں ٹی وی بھی تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ ٹیلی فون بھی ۔۔۔

ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایڈمنسٹریٹر سے ملیں گے اور یہاں منتقل ہونے کی درخواست کریں گے۔

مارگریٹ تھی تو اجنبی، لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

rekhta

rekhta

میں اور مارگریٹ اگلے دن ہی ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے جو ایک سوڈی شـ
تھا ملنے گئے۔

دفتر کیا تھا ایک بڑا ہال تھا، ہماری خواب گاہوں سے دس گنا بڑا ۔۔۔ وہ ایک
بڑی سی میز کے ایک طرف بیٹھا تھا، جیسے کسی تخت پر براجمان ہو ۔۔۔ سفید تو
سر پر رومال باندھے ہوئے اپنی داڑھی کو ایسے کھجا رہا تھا جیسے پوری دنیا کا مالک ہو

"اجازت ہے ۔۔۔؟" ہم دونوں نے پوچھا۔

"اندر آ جاؤ!" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ہم آپ سے کچھ درخواست کرنے آئے ہیں!"

"کہو!" اس نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔

"ہمارے کمرے بہت چھوٹے ہیں، ہم دونوں ایک بڑے کمرے میں منتقل ہونا چاہتے ہیں
"تین مہینوں سے پہلے منتقل نہیں ہو سکتیں ۔۔۔" اس نے بڑے حتمی انداز میں کہا ۔۔۔ ا

خاموش ہو گیا۔

گویا کہ حکم صادر ہو گیا۔

میں اور مارگریٹ حیران و پریشان رہ گئے ــــ ہماری حالت کا کوئی احساس نہیں۔ ہمدردی کا ایک لفظ تک ناپید۔

اس نے ہمیں اس انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ــــ "چلی کیوں نہیں جاتیں"۔

مارگریٹ جانے کے لئے مڑ گئی لیکن میں کھڑی رہی۔

"تم کیا چاہتی ہو ــ؟" اس نے خشک لہجے میں کہا

"میرے کمرے میں ریڈیو ہے نہ ٹی وی ــــ نہ آئینہ ہے نہ استری کرنے کا میز ــــ مجھے تو قیدخانہ لگتا ہے اپنا کمرہ ــــ میں مارگریٹ کے ساتھ بڑے کمرے میں رہنا چاہتی ہوں"

"اور بھی تو بیسیوں نرسیں رہ رہی ہیں"۔ اس نے توجیہہ پیش کی۔

"مجھے اوروں سے کیا مطلب ــــ؟ میں ایسے حالات میں نہیں رہ سکتی ــــ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ رہائش کا آرام دہ انتظام ہو گا ــــ میرا کمرہ قطعاً آرام دہ نہیں ہے"۔

"اچھا ــــ اگلے ہفتے منتقل ہو جانا ــــ!" اس نے ایسے کہا جیسے ہم سے ہمدردی نہ ہو بلکہ ہم سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو ــــ

ہم کمرے سے نکل آئے ــــ

باہر آکر میں نے مارگریٹ کی طرف دیکھا۔ "فرعون کہیں کا ــ" میرے منہ سے بے اختیار نکلا ــــ

میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا سب چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

اس شام نو بجے مجھے اور مارگریٹ کو چھوٹے کمروں سے بڑے کمرے میں منتقل ہونا تھا۔ میں خوش تھی ــــ مصائب کے دباؤ اور یلغار میں بھی ہم نے اپنا راستہ نکال لیا تھا۔ میں اپ آپ پر ہنس رہی تھی ــــ خوش اس بات پر تھی کہ میرے جیل کے کمرے کا سائز بڑا ہو جائے گا، او مجھے ایک اور قیدی کی رفاقت نصیب ہو گی۔

میں نے اپنے دونوں سوٹ کیس نکالے، ایک میں کتابیں، کاپیاں، غسلخانے کا سامان ٹوتھ پیسٹ، برش، کنگھیاں، میک اپ کا سامان اور اپنا الارم کلاک رکھا۔ کتابوں سے سوٹ کیس کافی بھاری ہو گیا تھا ــــ دوسرے میں میں نے اپنے کپڑے رکھنے شروع کئے۔ وہ سب لباس ج میں نے دو ہفتے پہلے استری کر کے الماری میں لٹکائے تھے، اب دوبارہ لپیٹ کر رکھ رہی تھی اور جانتی تھی کہ مجھے ان سب کو دوبارہ استری کرنا پڑے گا لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی کیا تھا ــ اپن خواہشوں کی تکمیل کی کچھ تو قربانی دینی ہی پڑتی ہے ــــ مجھے حیرانی اس بات کی تھی کہ میں نے اس

rekhta

دوران صرف دو جوڑے پہنے تھے باقی ڈبے کے ڈبے لٹک رہے تھے ۔۔۔ دن کو ہسپتال سے ملا یونیفارم پہننا پڑتا اور شام کو قیمتی اور نئے لباس پہننے کا موقع نہ ہوتا۔ ان خوب صورت لباسوں کو گھر میں پہننے کا کیا فائدہ۔؟

جنگل میں مورناچا کس نے دیکھا۔

سامان کی پیکنگ سے فارغ ہوئی تو ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں بستر پر بیٹھ کر اپنی ماں کا خط پڑھنے لگی اور ساتھ ہی وہ ساری تصویریں ایک دفعہ پھر دیکھنے لگی جو انھوں نے خط کے ساتھ بھیجی تھیں ۔۔۔ اہل خاندان کی تصویریں ۔۔۔ دوستوں کی تصویریں ۔۔۔ ان سب لوگوں کی تصویریں جو سب ہی الوداعی پارٹی میں شریک ہوئے تھے اور جنھیں میری والدہ نے کھانے پر بلایا تھا ۔۔۔

بہت سے لوگوں کے لئے میرا سعودی عرب جانا ایک غیر متوقع چیز تھی ۔۔۔ اس فیصلے پر تو میں خود بھی حیران تھی ۔۔۔ بات مذاق سے شروع ہوئی تھی لیکن سنجیدہ ہو گئی، بہت ہی سنجیدہ ۔۔۔ میں اپنے مسلمان بوائے فرینڈ کے ساتھ بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی اور وہ مجھے اسلام کی عظمت پر لیکچر دے رہا تھا ۔۔۔

"تمھاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں!"

"وہ اس لئے کہ تم اسلامی ماحول میں پلی بڑھی نہیں!"

اچانک میری نظر اخبار میں ایک اشتہار پر پڑی ۔۔۔ سعودی عرب کے ہسپتالوں میں نرسوں کی ضرورت ہے، معقول آمدنی ۔۔۔ سال میں دو مہینے چھٹی ۔۔۔ گھر تک آنے جانے کا ہوائی جہاز کا کرایہ ۔۔۔

"علی! کیا خیال ہے ۔۔۔ میں سعودی عرب چلی جاؤں دو سال کے لئے ۔۔۔؟"

"کتنی خوش قسمت ہو گی ۔۔۔ میرا بس چلے تو وہاں جاؤں اور کبھی واپس نہ آؤں ۔۔۔ محمدؐ کے قدموں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جاؤں۔"

اس کی آنکھوں میں تقدس کے سائے لہرا گئے۔

"تو پھر جاتے کیوں نہیں ۔۔۔" میں نے مذاقاً کہا۔

اس نے بیر کے دو گھونٹ لئے۔ "میں بہت پاپی ہوں!"

"پاپی نہیں منافق ۔۔۔!" میں ہنس دی۔

بہر حال میں نے مذاق میں ایک درخواست بھیج دی ۔۔۔ دو ہفتے کے بعد ان کا جواب آیا۔ مجھے انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ ان کا ٹورانٹو میں ایک دفتر تھا ۔۔۔ میں انٹرویو کیلئے گئی ۔۔۔ بے دلی سے انٹرویو دیا ۔۔۔ لیکن حیرانی کی بات انھوں نے مجھے ملازمت پیش کر دی اور دو سال کا کنٹریکٹ بھیج دیا ۔۔۔ اب تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔

"جاؤں یا نہ جاؤں ۔۔۔؟"

میں سوچتی رہی اور دوست احباب سے مشورہ کرتی رہی ۔۔۔ ہر شخص کی جداگانہ رائے مجھے مزید کنفیوز CONFUSE کرتی رہی۔

جوئین (میری والدہ) ڈارلنگ تم پاگل ہوئی ہو، تمھارا دماغ خراب ہے ۔۔۔ سعودی عر مت جاؤ ۔۔۔ خدا کے لئے نہ جاؤ، وہاں عورتوں کو سنگسار کر دیتے ہیں۔"

ڈینیل (میرے والد) جاؤ بیٹی ۔۔۔! ابھی تو تم جوان ہو، تمھارے گھومنے پھرنے کے دن ہیں ۔۔۔ شادی ہو جائے گی، بچے ہو جائیں گے تو پھر ایسے کام کہاں کر سکو گی!"

ڈیرک (میرا بھائی) عرب ممالک میں عورت کا تنہا جانا ٹھیک نہیں، مرد ساتھ نہ ہو تو ا بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔"

سیبل (میری بہن) "تم بھی تھوڑی ہی بچی ہو کہ کوئی گود میں لے کر پھرتا رہے گا، جوان عورت ہو، اپنا خیال خود رکھ سکتی ہو۔"

لوری (میری سہیلی) عرب ممالک میں ہر وقت جنگ چھڑی رہتی ہے ۔۔۔ بم گرتے رہتے ہیں ۔۔۔ کسی کی جان بھی وہاں محفوظ نہیں ۔۔۔ مشرق وسطیٰ جانا تو گویا موت ک دعوت دینا ہے۔"

جنٹ (رفیق کار) "سعودی عرب محفوظ جگہ ہے ۔۔۔ وہاں کوئی جنگ نہیں ۔۔۔ و شمالی امریکہ اور یورپ کے لوگوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔"

علی (بوائے فرینڈ) سعودی عرب تو اسلام کا مرکز ہے ۔۔۔ لاکھوں مسلمان م

ر عورتیں وہاں ہر سال حج کرنے جاتے ہیں ـــــ ساری دنیا کا مرکز کعبہ ہے ـــــ اس ماحول
ں سانس لینا بھی ثواب ہے۔"

میں سب کی باتیں سنتی رہی اور فیصلہ ٹالتی رہی ـــــ آخر مجھے دو ہفتے کے بعد
یصلہ کرنا تھا۔

آخری فیصلہ کرنے کے لئے میں رات کو بہت دیر تک سوچتی رہی۔

میں آخر زندگی سے کیا چاہتی ہوں ـــــ تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

کسی نے مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ زندگی گائے کی طرح ہے اور انسان اس کا بچھڑا
ـــــ بچہ جتنا منہ مارتا ہے ماں اتنا ہی دودھ دیتی ہے۔

اپنی زندگی پر نظرثانی کی تو عجب بوریت ہوئی ـــــ

ہر صبح سات بجے اُٹھنا ـــــ ہسپتال جانا ـــــ RE HABILITATION WARD
ے ایسے مریضوں کا خیال رکھنا جن کے اعضا برسوں سے STROKE کی وجہ سے مفلوج ہو چکے
یں اور وہ موت کا انتظار کر رہے ہیں لیکن ہم طب کی جدید تحقیقات اور انسانی ہمدردی کے
م پر انھیں مرنے بھی نہیں دیتے ـــــ شام کو اپنے ایک بیڈ روم میں ٹی وی دیکھنا ـــــ
فتے میں ایک دو دفعہ FITNESS CLASSES میں جانا تاکہ جسم کی دل کشی میں فرق
آئے ـــــ

ویکینڈز پر اپنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ کھانا کھانے یا فلم دیکھنے چلے جانا اور مہینے
یں ایک آدھ دفعہ اہلِ خاندان کے ڈنر میں شریک ہونا ـــــ

عجب بے مقصد سی زندگی تھی ـــــ نہ دن کو کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش آتا، نہ رات کو
ئی قابلِ ذکر خواب دکھائی دیتا ـــــ اگرچہ زندگی میں نہ تو کوئی دکھ تھا نہ غم ـــــ نہ سنگین

مسائل کا سامنا تھا اور نہ الجھنوں سے مڈبھیڑ ـــــ اس کے باوجود زندگی میں کوئی حرکت
نہیں تھی ـــــ جذبہ نہیں تھا ـــــ رنگارنگی نہیں تھی ـــــ اور میں شمالی امریکہ کی ہزاروں
عورتوں کی طرح ایک معمولی زندگی کی تمام اذیتیں اپنے کندھوں پر اُٹھائے چہرے
پر ایک خوش گوار مسکراہٹ سجائے آگے بڑھ رہی تھی۔

میں نے کنٹریکٹ پر دستخط کر دیئے اور سعودی عرب جانے کی تیاری شروع کر دی۔

ان تصویروں نے میرے دل و دماغ کے نازک کونوں کو گدگدا دیا تھا۔

میں نے ابھی یہ تصویریں آدھی بھی نہ دیکھی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی ـــــ
وہ مارگریٹ تھی ـــــ

کہاں کینیڈا کے ویکنڈ اور کہاں سعودی عرب کے ویکنڈ۔

کہاں کینیڈا میں جمعہ کی رات کو فلم دیکھنا، ہفتے کی رات کو کلب میں پینا پلانا، رات
و بجے تک ناچ گانے میں مصروف رہنا اور پھر اتوار کو چرچ جا کر گناہوں کی توبہ کرنا اور کہاں
سودی عرب میں خاموشی سے صرف جمعہ کا دن گزارنا ___ یہاں تو ویکنڈ کا تصور ہی نہیں ہے
نچ دن کام کرنے والے کے لئے ہفتے میں چھ دن کام کرنا عذاب جان بن جاتا ہے۔

جب میں گھر میں تھی تو بھاگ جانے کو جی چاہتا تھا اور جب یہاں آ گئی ہوں تو گھر کی یاد
ستاتی ہے ___ ماں باپ، بھائی بہن، سہیلیوں اور علی کی باتیں یاد آتی ہیں۔

آج بھی جمعہ کا دن ہے، پورے ہوسٹل کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے ___ باہر سورج
ی کرنیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں لیکن لڑکیاں سو رہی ہیں، عجب سستی کی حکمرانی ہے
ارگریٹ اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے گئی ہے۔

میں نے ایک چادر اٹھائی اور باہر گھاس پر جا کر دھوپ میں لیٹ گئی ___ کینیڈا ہوتا

تو کپڑے اتار کر لیٹتی لیکن یہاں اس کی اجازت نہیں ___ جسم کا سر سے پاؤں تک ڈھکے رہنا فرض
ہے، مسلمان اسے "ستر" کہتے ہیں، عورت کو صرف چہرہ، ہاتھ اور پاؤں ظاہر کرنے کی اجازت
ہے، البتہ مردوں کو صرف ناف سے گھٹنوں تک چھپانے کا حکم ہے ___ خدا جانے یہ قانون
کس نے بنایا ہے ___؟

دھوپ میں لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجھے غنودگی آنے لگی لیکن میں سونا نہیں
چاہتی تھی ___ کوئی بات کرنے کو بھی نہیں تھا ___ ریڈیو پر عربی میں کوئی مذہبی پروگرام نشر
ہو رہا تھا جسے سننے کا مجھے زیادہ شوق نہ تھا ___ اس ہوسٹل سے باہر جانے کی اجازت نہیں
تھی اور اجازت ہوتی بھی تو کہاں جاتی ___ نہ کسی سے جان پہچان نہ کسی سے آشنائی ___
نہ کوئی دوست نہ رشتہ دار ___ سوچا کیوں نہ خطوط ہی لکھوں، کچھ دل کا غبار ہلکا ہوگا ___
چنانچہ میں کمرے سے کاغذ قلم لے آئی اور دھوپ میں درخت سے ٹیک لگا کر خط لکھنے بیٹھ گئی۔

ڈیر لوری!

ایک وہ وقت کہ ہم دونوں ہر روز گھنٹوں گپ شپ لگاتے اور ایک دوسرے کو دل کی باتیں سناتے تھے۔ ایک یہ وقت کہ چھ ہفتے گزر گئے اور ہم نے بات تک نہیں کی۔

تمھارا کیا حال ہے ۔۔۔؟ تمھارے مریضوں کا کیا حال ہے۔؟ میرے مریضوں کا کیا حال ہے ۔۔۔؟ کیا ان میں سے کوئی موت سے ہم آغوش تو نہیں ہو گیا ۔۔۔؟

لوری ۔۔۔! میں کینیڈا میں REHAB ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی تھی اور یہاں بھی اسی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوں لیکن دونوں میں بہت فرق ہے ۔۔۔ کینیڈا میں میرے سارے مریض عمر رسیدہ تھے اور کئی تو موت کی دہلیز پر بیٹھے تھے ۔۔۔ بہت سوں کے دماغ

ماؤف ہو چکے تھے، نہ تو انھیں اپنی عمر یاد تھی اور نہ ہی وہ اپنی شریکِ حیات کو پہچان پاتے تھے، میں انھیں دیکھ کر اُداس ہو جایا کرتی تھی ۔۔۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ ایسے کام میں دلچسپی رکھتے ہوں لیکن مجھ پر اداسی کے بادل چھا جایا کرتے تھے ۔۔۔ سعودی عرب کے مریض مختلف ہیں، اکثر مریض جوان ہیں ۔۔۔ ایسے سعودی جو حادثات کا شکار ہو گئے ۔۔۔ حادثات بھی ایسے کہ کینیڈا میں رہ کر میں ان کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی ۔۔۔ میری ایک مریضہ نوجوان لڑکی ہے جو ڈیٹس (کھجوروں) کے درخت پر چڑھتے ہوئے گر پڑی اور گردن ٹوٹ گئی ۔۔۔ ویسے تو کینیڈا میں بھی لڑکیاں ڈیٹس پہ جاتی ہیں، اور ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں بعض دفعہ گردنیں بھی ۔۔۔

دوسرا مریض ایک جوان آدمی ہے جو صحرا میں کار چلا رہا تھا اور اس کی ٹکر اونٹ سے ہو گئی ۔۔۔ اس حادثے کو بھی تصور میں لانا میرے لیے مشکل ہے ۔۔۔ تم شاید یہ کہو کہ اسے کار چلانا نہیں آتی تھی ۔۔۔ میں یہاں ہوتی تو میں بھی شاید یہی کہتی لیکن یہاں HIGHWAYS پر رات میں اکثر اونٹ آ جاتے ہیں اور یہ حادثے جتنے خوفناک ہیں اتنے ہی یہاں عام ہیں۔ تم نے دیکھا یہاں کے حالات کتنے مختلف ہیں ۔۔۔ اگرچہ میں ان مریضوں سے ایک مترجم کی وساطت سے بات کرتی ہوں، پھر بھی گفتگو کافی دلچسپ ہوتی ہے ۔۔۔ اکثر مریض دیہاتی ہیں ۔۔۔ وہ سادہ، پُرخلوص اور معصوم ہیں ۔۔۔ مجھے لگتا ہے دنیا کے سارے معمولی لوگ شخصیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہوتے ہیں ۔۔۔ وہ شاید بہتر انسان ہوتے ہیں۔ اور "ترقی یافتہ" دور کے انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔

میرا ایک ادھیڑ عمر کا مریض مجھ پر بہت مہربان رہتا ہے۔ وہ مجھے اپنے بیٹے سے متعارف کروانا چاہتا ہے۔

امید ہے تم خط لکھتی رہا کرو گی ۔۔۔ پردیس میں میں خطوں

خطوں کی راہ تکتی رہتی ہوں۔ بس احباب کی خدمت میں آداب۔

خط کی منتظر

ورانیکا

میں نے خط ختم کیا تو مجھے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے مڑکر دیکھا تو مجھے ایک جوان ٹینڈ TANNED عورت نظر آئی۔ اس کے بال لمبے، سیاہ اور خوب صورت تھے۔

"ہیلو!" وہ بولی۔

"ہیلو۔ سلام ـــــ" میں مسکرائی۔

"کتنی حسین دھوپ ہے!"

"آپ بہت ٹینڈ ہیں۔"

"میں پیدائشی طور پر ٹینڈ ہوں، میں نے ہندوستان میں جنم لیا تھا۔"

"میرا نام ورانیکا ہے، میرا تعلق کینیڈا سے ہے!"

"میں حمیرا ہوں۔ شکاگو میں رہتی ہوں۔ دو مہینے ہوئے یہاں چلی آئی۔"

"مجھے بھی تقریباً اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔"

"میں ویک اینڈز پہ بور ہو جاتی ہوں، یہاں کرنے کو کچھ نہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں ـــــ شاید مسلمانوں کو تفریح سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"میں بھی تو مسلمان ہوں اور تفریح کو پسند کرتی ہوں ـــــ یہ شاید سعودی عرب میں ہی ایسا ہے کہ تفریح کا کوئی معقول انتظام نہیں ـــــ اگر آپ ایشیا کے دیگر ممالک میں ہوتیں تو حالات کتنے مختلف ہوتے ـــــ سعودی عرب میں کچھ پابندیاں زیادہ ہیں ـــــ وہ بھی عورتوں کے لئے ـــــ"

"میرا تو بعض دفعہ دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"کیا آپ کبھی شکاگو یا ہندوستان گئی ہیں۔؟"

"نہیں ـــــ! امریکہ کئی دفعہ جانے کا اتفاق ہوا ـــــ لاس ویگس ـــــ واشنگٹن اور نیویارک کی سیر کی لیکن شکاگو نہیں گئی ـــــ میری ایک ہندوستانی دوست ـــــ

راشدہ جب شکاگو گئیں تو انھیں ایک دلچسپ تجربہ ہوا۔"

"وہ کیا ـــــ؟"

"شکاگو جانے سے پہلے اسے اپنی جلد کی رنگت کا احساس اس شدت سے نہیں ہوا تھا۔ ایک دن وہ شہر کے شمالی حصے میں سب وے پر چڑھی۔ چاروں طرف گورے لوگ تھے۔ وہ واحد بھورے رنگ کی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ سب سے زیادہ کالی ہے ـــــ سب وے شہر کے وسط میں پہنچا تو مسافروں میں سے آدھے کالے اور آدھے گورے تھے اور جب وہ شہر کے جنوب میں پہنچی تو سب مسافر کالے تھے وہ واحد بھوری عورت تھی، اسے یوں لگا جیسے وہ ان سب میں گوری ہے۔"

"مجھے بھی چند ایسے ہی تجربات ہوئے جب میں جنوبی افریقہ گئی۔"

"آپ وہاں کیا کر رہی تھیں۔؟"

"وہاں میرے کچھ رشتہ دار رہتے ہیں۔ میرے چند احباب سعودی عرب میں بھی ہیں۔ اگر تم چاہو گی تو میں تمھیں ان سے ملوا دوں گی۔ اگر تم مختلف ممالک کے مسلمانوں سے ملو گی تو تمھیں مسلم دنیا کا بہتر اندازہ ہو گا ـــــ سعودی عرب تو بہت عجیب و غریب جگہ ہے!"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میرا کوئی ہم خیال بھی ہے۔"

"کوئی فکر کی بات نہیں ـــــ جب کبھی فارغ ہو ملنے آجایا کرو۔ میں کمرہ نمبر ۲۰۶ میں رہتی ہوں، میری روم میٹ ویک اینڈز پر چلی جاتی ہے اور میں تنہا ہوتی ہوں!"

"میرا بھی یہی حال ہے ـــــ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ـــــ مسلمان ہونے کے ناطے شاید تم مجھے اس ماحول اور ثقافت کو زیادہ اچھی طرح سمجھا سکو۔"

"کوشش کروں گی!"

وہ شام عجب بے یقینیوں کی تھی۔

حمیرا مجھے اپنے ساتھ اپنے دوستوں کے گھر لے گئی — میں خوش تھی کہ مسلمان خاندانوں سے ملاقات ہوگی۔

راستے میں ہم تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔

"تم سعودی عرب کیوں آئیں —؟" میں متجسس تھی۔

"کچھ پیسے کمانے کے لئے —" اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ پھر وضاحت کی۔

"میں شکاگو میں پانچ سال تک بطور نرس کام کرتی رہی ہوں لیکن میں خوش نہ تھی۔ میں تیس سال کی ہونے والی ہوں — مجھے اندازہ تھا کہ میرا شغف طب کی نسبت تہذیب و ثقافت سے زیادہ ہے اس لئے میں چاہتی تھی کہ یونیورسٹی جاکر سوشیالوجی پڑھوں لیکن میرے پاس فیس اور کتابوں کے لئے پیسے نہ تھے — میں نے سوچا کہ اگر میں سعودی عرب میں دو سال ملازمت کرلوں تو سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں اور میں ایم اے، میں داخلہ لے سکتی ہوں۔

اس کے علاوہ سعودی عرب میں رہنے سے مجھے تہذیبی اور معاشرتی طور پر ایسے تجربات بھی پیش آئیں گے جو مجھے سوشیالوجی میں ممد ثابت ہوں گے۔"

"میں تمہارے ذوق و شوق سے متاثر ہوں۔"

"تم بھی مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔" اس نے سوال کیا۔

میں چند لمحے خاموش رہی اپنے خیالات کو یکجا کرنے کے لئے۔

ہم ایک بس کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے کیوں کہ ہمارے پاس کار نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ سعودی عرب میں عورتوں کو کار چلانے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ حکومت انھیں ڈرائیونگ لائسنس ہی نہیں دیتی —

"مجھے دنیا دیکھنے اور نئے نئے تجربات کرنے کی بہت خواہش تھی — ٹورانٹو کی ملازمت اور ایک بیڈ روم کی زندگی پر بوریت کے سائے لہرانے لگے تھے — مجھے اسلام کو سمجھنے کی بھی تمنا تھی — کیوں کہ میرا بوائے فرینڈ ایک ایرانی مسلمان ہے — میرے خیال میں سعودی عرب اس کام کے لئے اچھا ملک تھا —"

"لیکن تم اسلام کو سمجھنا چاہتی ہو یا مسلمانوں کو —؟"

"کیا ان میں کوئی فرق ہے —؟"

"بہت — اگر تم اسلام کو سمجھنا چاہتی ہو تو تمھیں قرآن کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اس پیغام کو سمجھنا ہوگا جسے حضرت محمدؐ پوری انسانیت کے لئے لے کر آئے تھے — ایک مسلمان ملک میں زندگی گزارنے سے صرف یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اس علاقے کے مسلمان کس طرح رہتے ہیں — یہ بھی ممکن ہے کہ ان مسلمانوں کے طرزِ حیات کا اسلام سے دور کا بھی رشتہ نہ ہو —

میرا خیال ہے کہ اگر حضرت محمدؐ آج زندہ ہوتے اور مسلمانوں میں آپسی نفرت و دشمنی کی فضا اور مسلمان ممالک کی جنگیں دیکھتے تو بہت ہی شرمندہ ہوتے۔"

"مجھے اس بات کا احساس نہیں تھا۔"

"یہ صورت حال عیسائیوں اور یہودیوں سے زیادہ مختلف نہیں ہے!"

بس ایک جھٹکے سے رُکی ــــ ہم نیچے اُترے اور پیدل چلنے لگے ــــ ہماری منزلِ مقصود وہاں سے آدھ میل دُور تھی ــــ

"مجھے اپنے مسلمان بوائے فرینڈ کے بارے میں کچھ بتاؤ ــــ" حمیرا نے پھر سوال کیا۔

"وہ ایک وجیہ نوجوان ہے لیکن تضادات کا مجموعہ ہے ــــ میں اسے چاہتی بھی ہوں لیکن اس سے قدرے خائف بھی رہتی ہوں ــــ ہمیں ڈیٹنگ کرتے دو سال ہونے کو ہیں ــــ اس نے چند مہینے پہلے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن میں اسے ٹال گئی۔"

"کس قسم کے تضادات ــــ"

ہم آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہے تھے۔

"بہت سے ــــ وہ شراب پیتا ہے ــــ سؤر کھاتا ہے لیکن اپنے مسلمان دوستوں اور ان کے خاندانوں سے چھپ کر۔ وہ شادی سے پہلے جنسی تعلقات کو گناہ سمجھتا ہے لیکن ہم اکثر اکٹھے سوتے ہیں۔ وہ ایک پیارا عاشق ہے۔"

میں چند لمحوں کے لیے تصورات میں کھو گئی۔

"پچھلی دفعہ میرے برتھ ڈے پر اس نے میرے ساتھ رات گزارنے سے انکار کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا ــــ یہ محرّم کا مہینہ ہے اس مہینے میں حسینؓ کو شہید کیا گیا تھا ــــ میں بڑی دل شکستہ ہوئی۔

ہمارے تعلقات میں ماہِ رمضان میں بڑا کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے کیوں کہ اس مہینے میں بوس و کنار سے بھی محروم رہتی ہوں ــــ وہ اپنے بعض مذہبی دوستوں سے مجھے گرل فرینڈ کی بجائے صرف فرینڈ کہہ کر متعارف کرواتا ہے ــــ اس کے علاوہ بھی روزمرہ زندگی میں بیسیوں تضادات ہیں ــــ

میرا خیال تھا کہ اگر میں اس کے مذہبی ورثے اور ثقافت سے واقفیت حاصل کر لوں تو شاید اسے سمجھنے میں آسانی ہو۔"

"تو کیا تم اس سے شادی کرو گی۔" حمیرا مسکرائی۔

"دل کہتا ہے آگے بڑھتی چلی جاؤ لیکن میرا ذہن زرد بتی دکھاتا ہے!

زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔" حمیرا ہنسی۔

"اور نہ ہی محبت!"

ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔

ہم ایک ہندوستانی گھرانے کے مہمان تھے۔ خاوند ایک انجینئر تھا اور بیوی ایک گرہستن۔ ان کے ہاں دو اور خاندان بھی مدعو تھے ــــ ایک پاکستانی خاندان مدینہ سے آیا تھا اور ایک بنگلہ دیشی خاندان مکّہ سے ــــ بیویاں خوب صورت ملبوسات سے آراستہ تھیں۔ ایک نے شلوار اور دو نے ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں ــــ مردوں نے عام سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

حمیرا نے ان سب سے میرا تعارف کروایا۔ ان سب کے نام میرے لیے نئے اور اجنبی تھے، مجھے یاد نہ رہ سکے ــــ سب سے پہلے میں اس بات پر حیران ہوئی کہ وہ سب مسلمان تھے لیکن عربی سے نابلد ــــ

"ہم آج 'صوفہ پارٹی' کا انتظام کریں گے ــــ" میزبان نے ہمیں مطلع کیا۔

"اس کا کیا مطلب ہے ــــ" میں نے اپنی حیرانی کا اظہار کیا۔

مجھے کنیڈا کی 'ٹوگا پارٹی' کی یاد آ گئی۔

"میرا مطلب ہے کہ ہم سب صوفوں پر بیٹھیں گے ــــ ماضی میں ہم صوفے ہٹا کر زمین پر چاندنی بچھا لیا کرتے تھے اور آرام سے بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن اب ہمیں ڈر لگتا ہے" میزبان نے تشریح کی۔

"ڈر کس بات کا ــــ" میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

"دو ہفتے پہلے ہمارے ایک ہمسائے نے ایک مذہبی محفل کا انتظام کیا۔ دوست احباب جمع تھے، ذکر اور دعا میں مصروف تھے کہ پولیس نے چھاپہ مارا اور ان سب لوگوں کو گرفتار کر لیا ــــ

انھیں گرفتار کیوں کیا — تو میں ابھی بھی مخمصے میں پھنسی ہوئی تھی۔

"قانون کے مطابق کسی کے گھر میں پانچ سے زیادہ لوگوں کے جمع ہونے کی اجازت نہیں ہے — کیوں کہ پولیس کو یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں حکومت کے خلاف کارروائی نہ ہو رہی ہو — لیکن اگر ہم صوفوں پر بیٹھے رہیں اور پولیس آ بھی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب بن بلائے مہمان ہیں —"

مجھے اس خوف و ہراس کی حقیقت اور سنگینی کا آہستہ آہستہ اندازہ ہو رہا تھا —

شام کا کھانا نہایت لذیذ تھا۔

انواع و اقسام کے کھانے، کری، قورمہ، شامی کباب اور رس ملائی مجھے بہت پسند آئے۔ میں نے کچھ زیادہ ہی کھا لیا۔ آخر میں ہندوستانی مصالحہ دار چائے بھی پی —

گفتگو مختلف زبانوں میں ہو رہی تھی — وہ آپس میں اردو میں بات کرتے لیکن میرے ساتھ بات کرتے تو انگریزی میں — میں ان کے خلوص اور مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوئی —

کھانے کے بعد میں نے ہر خاندان سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی — سب نے مجھے دلچسپ واقعات سنائے — ان کی مشکلات اور ان کے مسائل سنجیدہ اور غور طلب تھے —

مکہ سے آنے والے خاندان کو بچوں کی تعلیم کا مسئلہ درپیش تھا — بچوں کی والدہ کہنے لگیں۔

"ہمارے بچوں کو ہر روز اسکول جانے کے لئے جدہ جانا پڑتا ہے۔ چھ اور سات سال کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں — ان بے چاروں کو صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھاتی ہوں!"

"اسکول پہنچنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔؟"

"بس میں تقریباً ایک گھنٹہ!"

"کیا مکہ میں ان کے لئے اسکول نہیں ہیں؟"

"نہیں — مکہ اور مدینہ میں انگریزی اسکولوں کی اجازت نہیں۔"

"وہ کیوں —؟"

"وہ مقدس مقامات ہیں، وہاں صرف عربی میں تعلیم دی جا سکتی ہے۔"

"یہ بات تو میری سمجھ سے باہر ہے۔"

"میری بھی!"

مجھے اپنی عقل کی کم مائیگی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔

مدینہ سے جو خاندان آیا تھا ان سے کچھ رشتہ دار ملنے آئے تھے جس کی وج سے انھیں بہت سی دشواریاں پیش آئی تھیں۔

"کیا ہوا —؟"

مخدومہ نے وضاحت کی "پچھلے سال میری ساس اور سسر دو ہفتوں کے لئے عمرہ کرنے آئے۔ ان کا ٹھہرنا ایک ڈراؤنا خواب تھا — پہلے دن ہی پولیس نے ہمیں روک اس ملک میں چاہے آپ برسوں سے رہ رہے ہوں اجازت نامے کے بغیر ایک شہر سے دوسر شہر نہیں جا سکتے — ہم وہ اجازت نامہ گھر بھول آئے تھے — پولیس نے میرے خا کو راہ چلتے مسافروں کو اپنی گاڑی میں سوار کرنے کا چالان کیا۔

"لیکن یہ میری ماں ہے!" میرے میاں نے سمجھانا چاہا۔

"تم اپنی کار کو ٹیکسی کی طرح استعمال نہیں کر سکتے — اسے کہیں بھیجنا ہے تو ٹیک میں بٹھا کر بھیجو!"

وہ پولیس والا جسے یہاں سب شرطہ کہتے ہیں، بہت غصے میں تھا اور اس نے میر خاوند کو جیل میں ڈال دیا — وہ جیل میں نہ جانے کب تک رہتا — یہ تو اچھا ہوا کہ ا عرب بوس نے ہماری منت سماجت سن لی اور اگلے دن سفارش کر کے انھیں رہا کروا دیا۔

جانے سے ایک دن پہلے میری ساس اور سسر آخری مرتبہ عمرہ کرنے گئے۔

جب وہ خانہ کعبہ سے نکل رہے تھے تو وہ ۴۰، اور لوگوں کے ہمراہ گرفتار کر —

ئے۔ ہم گھر میں گھنٹوں ان کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آئے ــــ پریشانی سے ہمارا ل خراب تھا ہمیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کس جیل میں ہیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ حج سے دو ہفتہ پہلے وہ کسی کو عمرے کا ویزا نہیں دیتے اور مکہ ر مدینہ میں پابندیاں لگ جاتی ہیں۔ اگر کوئی غیر قانونی طور پر گھوم پھر رہا ہو تو ے گرفتار کر لیا جاتا ہے ــــ لیکن میری ساس اور سسر کا ایک دن باقی تھا ــــ اُن کا یام غیر قانونی نہیں تھا ــــ

ایک دن گزر گیا ــــ پھر دو دن ــــ انھیں بیس اور لوگوں کے ساتھ جیل کے رے میں بند کر دیا گیا تھا ــــ جہاں نہ کھانے پینے کا معقول انتظام تھا اور نہ ہی سلخانوں کا ــــ وہ بہت پریشان ہوئے ــــ

جب ہمیں یہ پتہ چلا کہ وہ کس جیل میں ہیں اس وقت تک ان کا تبادلہ جدّہ ں بڑی جیل میں ہو چکا تھا ــــ ہم نے ایمبیسی کو فون کیا لیکن انھوں نے کچھ صلہ افزائی نہیں کی ــــ

چار دن کے بعد انھیں رہائی ملی ــــ اس سلسلہ میں سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ تیش کے دوران پتہ چلا کہ وہ شرطہ جس نے میری ساس اور سسر کو گرفتار کیا تھا اسے سپورٹ پر عربی پڑھنا نہ آتا تھا ــــ

میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی پولیس نہیں دیکھی جس کے اتنے زیادہ اختیارات وں اور اتنی کم ذمہ داریاں۔"

ہمارے جدہ کے میزبان نے بتایا کہ وہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس لینے گیا تو اس سے بردستی خون کی ایک بوتل لی گئی۔

"زبردستی کیوں ــــ ؟"

سعودی عرب نے یورپ اور امریکہ سے ایڈز کے ڈر سے خون منگوانا بند کر دیا ہے سلئے جو بھی ڈرائیونگ لائسنس لینے کے لئے جاتا ہے اُسے خون دینا پڑتا ہے!"

میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں۔

اس نے مجھے اپنے ایک سیلونی دوست کا واقعہ بھی سنایا ــــ وہ سیلونی دوس جو سرجن تھا، سعودی عرب میں ملازمت کرنا چاہتا تھا ــــ اسے چھ ہزار ریال کی تنخواہ بتا گئی لیکن جب اس نے بتایا کہ اس کے پاس کنیڈا کی شہریت اور پاسپورٹ ہے تو اس کی ت بڑھا کر تیرہ ہزار ریال کر دی گئی ــــ وہی ڈگریاں ــــ وہی تعلیم اور وہی تجربہ۔

میری حیرانی بڑھتی جا رہی تھی ــــ

اس شام جس واقعہ نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے وہ بچے کے ڈاکٹ کا واقعہ تھا ــــ اسے ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ جمعہ کو خانۂ ک کے باہر حاضر رہے کہ اگر کسی چور کا ہاتھ کاٹا جائے تو وہ اسے لوکل انستھیزیا OCAL ANAESRHESIA دے سکے۔

"اس کی کیا ضرورت ہے ــــ ؟"

"تاکہ چوروں کے ساتھ ہمدردانہ سلوک ہو سکے!"

"اور اگر تم نے انکار کر دیا تو ــــ ؟"

"ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی!"

مجھے اس کی حالت پر رحم آیا۔

جب میں حمیرا کے ساتھ واپس بس میں آ رہی تھی تو میرے ذہن میں سوالو بہت سے ناگ رینگ رہے تھے ــــ

"حمیرا کیا تم نے سنا کہ سعودی حکومت تنخواہ کا تعین آپ کی تعلیم اور تج کی بنیاد پر نہیں کرتی بلکہ فیصلہ آپ کی شہریت کی بنا پر ہوتا ہے۔"

"یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے!"

"تعصب ہے تعصب!"

"اس کی بھی کئی سطحیں ہیں ــــ جیسے ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم ہے جنوبی افریقہ میں اپارتھیڈ کی تعریف ــــ اسی طرح یہاں کے معاشرے میں بھی حص طبقے ہیں۔"

rekhta

"کون سے چار ــــ" میں ان سے واقف نہ تھی۔

"یہاں چار درجے کے شہری ہیں۔

سعودی مرد اور یورپ اور شمالی امریکہ کے سفید فام مرد پہلے درجہ کے۔

غیر سعودی عرب دوسرے درجے کے۔

بقیہ ایشیائی مرد جن میں پاکستان، ہندوستان اور فلپینی سب شامل ہیں،
ــرے درجے کے شہری۔

اور سیاہ فام اور عورتیں چوتھے درجے کے شہری۔"

"ہم نے مشرق و مغرب کے میڈیا میں کبھی اس پر احتجاج نہیں سنا۔"

"احتجاج تو اس وقت ممکن ہے جب کوئی صاف گوئی سے کام لے سکے۔ اور
ـان گوئی اسی وقت ممکن ہے جب کوئی اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو ــ امریکی
ـیا خاموش ہے کیوں ان کے اقتصادی اور سیاسی مفادات متاثر ہوتے ہیں ــــ
ـس لئے وہ انسانی حقوق اور معاشرتی ناہمواریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مسلمان
ـیا اس لئے مہر لب ہے کہ ان کی مذہبی انا آڑے آتی ہے۔ وہ گھر کی باتیں گھر میں ہی
ـمنا چاہتے ہیں۔ سب کے سامنے بے نقاب نہیں کرنا چاہتے۔"

شبرا نے یہ بھی بتایا کہ ایک دفعہ وہ مدینہ گئی اور مسجد نبوی کی تصویر لینے
ـں تو پکڑی گئی اور اس کا کیمرہ چھین لیا گیا۔ حکم صادر ہوا "اسلام میں تصویر لینے کی
ـنت ہے۔" جب وہ مسجد کے اندر داخل ہوئی تو چاروں طرف ٹی وی کے کیمرے نظر
ـے جو دیواروں اور چھتوں پر نصب کئے گئے تھے۔ ٹی وی پر ہر روز نماز دکھائی جاتی تھی

"کیسا تضاد ہے!" مجھ سے نہ رہا گیا۔

"تمہارے بوائے فرینڈ کی طرح!"

اس ویک اینڈ کے سفر نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔

زندگی کی تصویر کی کیفیت بدلتی جا رہی تھی۔
اس کے رنگ شاید کچے تھے جو سنگین حالات کی دھوپ سے
اڑے جا رہے تھے
جذبہ اور خلوص ماحول کی پتھریلی دیواروں سے سر ٹکرا کر
بے حال تھے۔
زندگی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

rekhta

میں غمگین و ملول تھی ___ اُداس تھی ___

گھر کی یاد بہت ستا رہی تھی ___

میرا خاندان، میرے دوست، علی، میرا اپارٹمنٹ، الغرض کینیڈا کی ہر یاد میرے ذہن میں پہلو بدل بدل کر اُٹھ رہی تھی ___ ان سب پر مستزاد وہ آزادی کا احساس تھا جو کینیڈا میں رہتے ہوئے تو نہ ہوتا تھا لیکن سعودی عرب میں چھن جانے سے بڑھ گیا تھا ___

حیرانی تو اس بات پر تھی کہ مجھے اپنے گرجے تک کی یاد آ رہی تھی، یہ بھولتے ہوئے کہ میں مذہبی نہیں اور گرجے سے میرا تعلق ایسٹر اور کرسمس کی کینڈل لائٹ سروس سے زیادہ نہ تھا ___

ایک شام ___ میں، مارگریٹ اور جمیرا بہت خوش تھے، ہم نے سوچا کہ مل کر سیر کرنے اور کچھ شاپنگ کرنے چلیں گے۔

بہت سی اور چیزوں کے علاوہ ہمیں ایک مقبول عام گروپ کا البم "ماڈرن ٹاکنگ ___" MODERN TALKING خریدنا تھا۔ ہم ایک میوزک اسٹور میں گھسنے لگے تو دوکاندار نے منع کر دیا۔ دوسری دوکان میں گئے تو اس نے اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ ہم بہت حیران ہوئے۔ جب تیسری دوکان پر بھی یہی حال ہوا تو بہت متفکر ہوئے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا جب ہم نے اندر جانے پر اصرار کیا تو منیجر نے دروازے پر چسپاں ایک نوٹس کی طرف اشارہ کیا۔ میں اور مارگریٹ تو اسے نہ پڑھ سکے۔ جمیرا نے پڑھا "ممنوع دخول النسا" جس کا مطلب تھا، عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے ___ مجھے کینیڈا کے وہ شاپنگ ہال یاد آ گئے جن کے دروازوں پر لکھا ہوتا ہے "کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

میں ساری شام گریہ وزاری کرتی رہی۔

اپنے خاندان کے افراد اور دوستوں کو لمبے لمبے خط لکھے۔

علی کی بھی بہت یاد آئی لیکن میں اسے خط نہ لکھنا چاہتی تھی ــــ نہ جانے کیوں ــــ ؟

ایک سہ پہر جب میں اپنے یونیفارم پر استری کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔

"اندر آجاؤ!" میں نے دور سے ہی آواز دی۔

حمیرا اندر داخل ہوئی اور کہنے لگی۔

"کیا تازہ خبر ہے۔؟"

"گھر کا کام کاج کر رہی ہوں تاکہ ساری تلخیاں بھول جاؤں!"

"کیوں ــــ کیا بات ہوئی۔؟"

"میں اپنے ایڈمنسٹریٹر سے ملنے گئی تھی ــــ اس ڈکٹیٹر کے بچے سے!"

"کس معاملے میں۔؟"

"میں نے اس سے کہا کہ مجھے ٹیلی فون کی ضرورت ہے اور اس نے اپنی بھدی آواز میں جواب دیا۔

"تمھارے پاس ٹیلی فون ہے تو سہی!"

"اُس ٹیلی فون کا کچھ فائدہ نہیں ـــ وہ یکطرفہ ہے ـــ اگر کوئی اور ٹیلیفون کرے تو میں بات کر سکتی ہوں ـــ خود بات نہیں کر سکتی ـــ مسئلہ یہ ہے کہ ٹورانٹو اور سعودی عرب کا سات گھنٹوں کا فرق ہے ـــ جب میرے خاندان والے یا دوست صبح فون کرتے ہیں تو میں ہسپتال میں کام کر رہی ہوتی ہوں اور جب وہ شام کو فون کرتے ہیں تو میں سو رہی ہوتی ہوں ـــ میں خود فون کرنا چاہوں تو مجھے شیریٹن ہوٹل تک دو میل پیدل چلنا پڑتا ہے اور پھر پبلک ٹیلی فون سے سکّے ڈال کر بات کرنی پڑتی ہے ـــ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ سکّے ختم ہو گئے تو فون کٹ گیا اور ہماری بات اَدھوری رہ گئی۔"

"ایک زمانے میں یہاں دو طرفہ ٹیلی فون ہوا کرتے تھے لیکن نرسوں نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور بل ادا کئے بغیر چلی گئیں۔"

"لیکن تم مجھ سے پیسے پیشگی لے لو۔"

میں نے بہت دلائل پیش کئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا ـــ انھیں اس کی جگہ وہاں ایک پتھر کا بت رکھ دینا چاہئے ـــ"

"وہ ابوجہل ہے!" حمیرا نے کہا۔

"اس کا کیا مطلب ہے۔؟"

"جہالت کا باپ ـــ حضرت محمدؐ کے زمانے میں ایک کردار ہوا کرتا تھا جس کا نام ابوجہل تھا۔"

"تو چلو آج ہم اُس کی ترقی کر دیتے ہیں ـــ اب ہم اسے ڈکٹیٹر کے بجائے جہالت کا باپ کہا کریں گے۔"

اور ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"حمیرا ـــ! تم بہت اچھی دوست ہو ـــ تم سے باتیں کر کے میرے دل کا غبار ہلکا ہو جاتا ہے ـــ اگر تم نہ ہوتیں تو میں کب کی پاگل ہو گئی ہوتی۔"

"میرا بھی یہی حال ہے ـــ تم تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہو ـــ تمھارے بغیر میں گھٹ گھٹ کے مر جاتی۔"

"حمیرا! ایک بات بتاؤ ـــ یہ لوگ ہم سے شرافت سے پیش کیوں نہیں آتے۔؟ انسانوں کا سا سلوک کیوں نہیں کرتے۔؟"

"درانیکا! کیا تم نے کبھی غور کیا کہ کرۂ ارض پر جتنے بھی پیغمبر آئے وہ سب مشرقِ وسطیٰ کے اسی چھوٹے سے ٹکڑے پر کیوں آئے۔؟"

"نہیں۔!"

"اگر کبھی فرصت کے لمحات ملیں تو اس بارے میں سوچنا۔"

rekhta

میں اکثر اوقات حمیرا یا مارگریٹ کے ساتھ بازار جاتی تھی ــــ ایک دن میں نے سوچا۔ "مجھے اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونا چاہیئے۔" اور میں اکیلے ہی شاپنگ ــــ کا پروگرام بنانے لگی ــــ شہر ہماری بلڈنگ سے تیرہ میل دُور تھا ــــ بسوں سے آنا جانا تھا ــــ بسیں روزانہ دو دفعہ صبح اور دو دفعہ شام کو آتی جاتی تھیں۔ اگر بس نہ ملے تو ٹیکسی سے آنا پڑتا تھا اور ٹیکسی بہت مہنگی پڑتی تھی ــــ

تنہا شاپنگ کرنا بھی عجیب تجربہ تھا ــــ بہت سے دوکاندار میری صُورت اور جلد کا رنگ دیکھ کر حیران تھے اور مجھے چھو کر دیکھنا چاہتے تھے ــــ جیسے میں کسی عجائب گھر کی مُورتی ہُوں۔

ایک شخص نے جب میرے ہاتھ کو چھُوا تو مجھے اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سی چمک نظر آئی۔

دُوسرے دوکاندار نے مشورہ دیا کہ اگر میں اسے بوسہ دوں تو وہ کپڑوں کی

قیمت میں تخفیف کر دے گا۔

تیسرے نے تو بالکل صاف الفاظ میں پُوچھ لیا کہ کیا میں اس کی گرل فرینڈ بنے
پر رضامند ہوں یا نہیں۔

مجھے وہ سب بچگانہ کی اور غیر موزوں باتیں لگیں لیکن میں ان سے گھبرائی
نہیں بلکہ دل ہی دل میں ہنستی رہی ــــ ساتھ ہی کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ "سعودی عر
میں عورت کا تنہا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔"

کوئی اور کہہ رہا تھا ــــ "تم اب جوان عورت ہو اور اپنا خیال خود رکھ سکتی ہو۔"

مجھے ابو جہل کا وہ نوٹس بھی یاد آیا جو دفتر کے ہر کمرے میں پہنچا تھا۔ اس میں
نوشتہ تھا۔ "عورتوں کو صرف اپنے محرموں کے ساتھ، جن میں ان کے باپ، بھائی، خاوند اور
بیٹے شامل تھے، شہر میں گھومنے کی اجازت ہے۔"

کوئی اس سے پُوچھتا کہ کیا ہم مُلازمت کرنے اپنے خاندان کے مَردوں کو ساتھ
لے کر آئے تھے۔

تضادات ــــ تضادات ــــ تضادات ــــ

مجھے علی کی شخصیت کے نیم تاریک کونوں میں جھانکنے کا موقع مل رہا تھا۔

جب میرے ادھیڑ عمر کے مریض کی کمر ٹھیک ہوگئی تو گھر جانے کی تیاریاں کرنے لگا
س نے مجھے اپنے گاؤں لے جانے کی دعوت دی — مجھے بھی نئے تجربات کا شوق تھا لہذا
س تیار ہوگئی —

اسے دو عورتیں گھر لے جانے آئیں — میں بھی ان کے ساتھ چل دی —
س نے میرے لئے کار کا دروازہ کھولا — اس میں میل شوونزم MALLE CHAUVANISI کی نہیں خلوص کی جھلک تھی۔

جب ہم گاؤں پہنچے تو ایک نوجوان ہمارا مترجم بنا۔ وہ انگلینڈ میں ایک سال
ہ کر آیا تھا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لیتا تھا — گاؤں میں میری آمد کی خبر
نگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی — مرد، عورتیں اور بچے سب مجھے دیکھنے آئے
ہ سب میری جلد کا رنگ دیکھ کر مسحور تھے اور اسے چھونا چاہتے — جیسے کوئی
ہزادی ہوں یا مونا لیزا کا بت — مجھے چاروں طرف معصومیت اور مہمان نوازی کے

پھول بکھرے ہوئے نظر آئے۔

کھانے کا وقت آیا تو سب زمین پر بیٹھ گئے، میں بھی شامل ہوگئی — ایک ایک رکابی میں چار پانچ لوگ اکٹھے کھانے لگے — انھوں نے کبھی چھری اور کانٹے استعمال نہ کئے تھے۔ ہاتھوں سے ہی کھانا کھاتے تھے — میرے مریض نے مجھے اپنی پلیٹ سے کھانے کی دعوت دی — مترجم نے بتایا کہ یہ اس کا مجھے عزت دینے کا طریقہ تھا۔ گھر کے مالک کے ساتھ کھانا کھانا سب کے لئے باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بہت سے چاول اور گوشت میری طرف سرکائے۔

وہ میرے لئے ایک بہت ہی خلوص اور محبت بھرا تجربہ تھا — وہ دیہاتی تھے لیکن بہت ہی نیک لوگ تھے — کیا ساری دنیا کے دیہاتی اور قبائلی لوگ حساس انسان ہوتے ہیں اور جب شہروں کی ماڈرن زندگی میں آکر بستے ہیں تو ان میں سے کچھ ابوجہل بن جاتے ہیں —

مجھے احساس ہونے لگا کہ ایک دن ہمیں تہذیب اور ثقافت کی تعریفیں بدلنی ہوں گی —

بہت سے لوگوں، پلیٹوں اور کھانوں کے ساتھ ساتھ مکھیاں اور چیونٹیاں بھی کافی تھیں لیکن کسی کو ان کی فکر نہ تھی — کئی چیونٹیاں چاولوں میں رینگ آئیں۔ اگر میں کینیڈا میں ہوتی تو میری حالت ضرور خراب ہو جاتی اور شاید قے بھی ہو جاتی لیکن اس ماحول میں وہ سب کچھ فطری لگ رہا تھا۔

کھانے کے بعد ہمیں ایسی کھجوریں پیش کی گئیں جن میں گٹھلیاں نام کو بھی نہیں تھیں۔

اوسان تو میرے اس وقت خطا ہوئے جب اس مترجم نے مجھے اس شخص کی دو بیویوں سے ملوایا — پہلی بیوی کا نام فاطمہ اور دوسری کا نام زینب تھا، وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتی تھیں۔

"کیا ان کی آپس میں لڑائی نہیں ہوتی —" میں نے قدرے پریشان ہو کر

سوال کیا۔

"نہیں!" اس نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

"کیا تم اس سے پُوچھ سکتے ہو کہ اس نے دُوسری بیوی بننا کیوں پسند کیا۔۔۔؟" میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی۔

"میری ایک دفعہ پہلے بھی شادی ہو چکی تھی ۔۔۔ جب میرا خاوند ہسپتال میں یرقان سے مرگیا تو مجھے احساس تنہائی ہونے لگا۔۔۔ میں اپنے بوڑھے والدین پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی ۔۔۔ مجھے پہلے خاوند نے مجھے پندرہ ہزار ریال دیئے تھے لیکن اس دفعہ چونکہ میں بیوہ تھی اس لئے میں نے سات ہزار پر ہی اکتفا کیا۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دلہنوں کے اس طرح دام لگتے ہیں۔

"شادی کے بعد تمھیں کیا محسوس ہوا۔۔۔؟" وہ مترجم اس دن بہت ہی سُودمند ثابت ہُوا۔ میں نے پہلی بیوی سے پُوچھا۔

"مجھے بہت سہولت ہو گئی ۔۔۔ میں دس سال تک گھر کا کام کاج کرتی رہی تھی جب دُوسری بیوی آئی تو اس نے گھر کا کام سنبھال لیا، اب میں بس اُوپرے اُوپرے کام کرتی ہوں اور اس پر نگاہ رکھتی ہُوں۔"

اس کی آواز میں اختیار اور ارادہ کے ساتھ ساتھ احترام کے رنگ بھی نمایاں تھے۔

مترجم نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ اپنے خاوند کے ساتھ سیر کرنے جاتی ہیں تو پہلی بیوی اگلی سیٹ پر اور دُوسری بیوی پچھلی سیٹ پر بیٹھتی ہے!

"دوسری شادی کے بعد تمھاری زندگی میں کیا تبدیلی آئی۔۔۔؟" میں نے خاوند سے پُوچھا۔

"زندگی آسان ہو گئی ہے ۔۔۔ اگر ان میں سے کسی ایک کے سر میں درد ہوتا ہے تو دوسری تیار ہو جاتی ہے ۔۔۔ اب یہ علیحدہ بات ہے کہ سر کے درد بھی جلد ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن دو بیویاں رکھنا تو اچھی بات نہیں ۔۔۔" میں نے مترجم سے کہا۔

"کیوں نہیں ۔۔۔ یہ تو ایمانداری کی بات ہے ۔۔۔ یورپ اور امریکہ میں تو لوگوں ک
ایک بیوی ہوتی ہے اور تین داشتائیں ۔۔۔ باقوں کو صیغۂ راز میں رکھنا کہاں کی دیانت داری ہے۔؟"

"کیا عورت ایک سے زیادہ مردوں سے شادی کر سکتی ہے۔۔۔؟"

"نہیں! اس سے یہ پتہ نہ چلے گا کہ بچّہ کس کا ہے اور خاندان کے نام کا بھی مسئ
پیدا ہو گا۔"

"بچّے تو ہمیشہ ماؤں کے ہوتے ہیں ۔۔۔ بچّے باپ کے نام کی بجائے ماں کا نام کیو
نہیں اختیار کرتے۔؟"

"اگر آپ مشرق و مغرب کی صدیوں کی روایت کو بدل سکیں تو شاید زندگی بہت
مختلف نظر آنے لگے۔"

ابھی ہماری گفتگو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچی تھی کہ باہر سے ہیرے کار کے تیار ہونے ک
آواز آئی۔ کوچ کا وقت آ گیا تھا۔

انھوں نے مجھے تحائف دیئے اور بڑے احترام و عقیدت سے خدا حافظ کہا۔

میری آنکھوں سے دو آنسو میرے گالوں پر اُتر آئے۔

میں ان کی روایات سے نابلد تھی لیکن پھر بھی دعاگو تھی۔

گھر آتے ہُوئے میں سوچتی رہی کہ "زندگی بھی کتنی پُراسرار ہے۔"

کئی مہینے گزر گئے۔

تنہائی کاٹنے کو دوڑتی۔

نہ کسی دوست نہ کسی رشتہ دار سے ملاقات۔ آخر خبر آئی کہ کنیڈا سے میرا ایک مسلمان دوست سعودی عرب آرہا تھا۔ میں بہت خوش تھی لیکن.....

وہ مکے شہر سے پچاس میل دور تین دن رہا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ معلوم یہ ہوا کہ عمرہ ویزا پر آیا ہے اس لئے مکے اور مدینے سے باہر نہیں جا سکتا اور میں غیر مسلم ہونے کی وجہ سے ان مقدس شہروں میں نہیں جا سکتی۔

وہ تو واپس چلا گیا اور میں اُداسیوں کے صحرا اور غم واندوہ کے سرابوں میں کھو گئی۔

مجھے آٹھ بجے کی بس پکڑنی تھی ــــ میں بس اسٹاپ کی طرف بھاگی لیکن میرے پہنچنے سے پہلے بس چل پڑی ــــ جو کمپدار اور ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بھاگتے دیکھا تو ہنسنے لگے۔ وہ میرا مذاق اُڑا رہے تھے۔

مجھے ان کا ہنسنا اچھا نہ لگا ــــ

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے گھر لے جانے کی درخواست کی تو وہ بے تحاشا ہنسنے لگا اور آگے بڑھ کر مجھے چھونا چاہا۔

میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اگر تم مجھے دو دفعہ بوسہ دو تو میں تمہیں لے جاؤں گا ــــ!" اس کی آنکھوں سے شیطانیت برس رہی تھی۔

"کتے کے بچے دفعہ ہو جاؤ ــــ" میں نے انگریزی میں گالی دی تاکہ وہ سمجھ نہ سکے..

چوکیدار بھی مذاق اُڑانے لگا۔

وہاں اور کوئی بھی نہ تھا نہ کوئی ٹیکسی نہ مُسافر۔

میں سیر کے لئے چل دی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے ــــ میں آدھ گھنٹہ بعد لوٹی تو وہ دونوں ابھی تک موجود تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی ذلیل خواہش کا دوبارہ اظہار کیا۔ مجھے اتنا غصّہ آیا کہ اس کے منہ پر تھوکنے کو جی چاہا۔

میں بس اسٹاپ کے اندر آرام سے بیٹھنے کی بجائے باہر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ وہاں آدھ گھنٹہ بیٹھی رہی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

بس آئی تو میں اُس میں تنہا مُسافر تھی ــــ بس ڈرائیور ایک نیک انسان تھا، اس نے مجھے تسلّی دی اور بڑی حفاظت سے مجھے میری بلڈنگ کے سامنے اُتار دیا۔

وہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں نے خود کو اتنا زیادہ خوف زدہ محسوس کیا تھا ــــ میری عمر اس ایک گھنٹے میں دس سال بڑھ گئی تھی ــــ شاید ایک دو بال بھی سفید ہو گئے تھے۔

جب میں اگلی صبح جاگی تو میرے سر میں درد تھا، بخار بھی ہو گیا تھا اور طبیعت بھی متلا رہی تھی ــــ میں کام کرنے کے اہل نہ تھی ــــ میں ایڈمنسٹریٹر کے دفتر گئی کہ اس دن کی چھٹی لے سکوں۔

”پہلے ڈاکٹر سے ملو اور میڈیکل سرٹیفکیٹ لے کر آؤ ــــ“ اس نے اپنی مہیب آواز میں کہا۔

میں ایک نرس تھی ــــ مجھے یوں لگا کہ اس نے میرے پیشے کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

میں ڈاکٹر سے ملنے گئی ــــ وہ ڈاکٹر بھی عجیب انسان تھا ــــ امریکی نژاد لمبے بال، لمبی داڑھی، ہپّی دور کا بچا کھچا مال لگتا تھا ــــ نرسوں نے مجھے بتایا کہ وہ سعودی عرب میں تین مہینے رہنے کے بعد مُسلمان ہو گیا تھا اور دو دفعہ شادی کی تھی،

اسے شاید اسلام کی یہی چیز سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔

میں نے اسے اپنی طبیعت کا حال بتایا اور ایک دن کی چھٹی کی درخواست کی۔

اس نے میرا معائنہ کیا ــــ میڈیکل سرٹیفکیٹ دیا اور ٹائینول کی گولیاں دیتے ہوئے کہا۔

”محترمہ! میرا خیال ہے آپ کا مسئلہ جسمانی نہیں، نفسیاتی ہے جو یہاں بہت سے مہاجروں کو پیش آتا ہے ــــ آپ کو کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنا چاہیئے۔“

میں خاموش رہی اور گھر آ کر سارا دن سوتی رہی۔

"تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا —" مارگریٹ نے مجھ سے پوچھا
"نہیں — ٹھیک نہیں — میرے پیٹ میں درد اور مروڑ پھر رہے ہیں — یہ میری ماہواری کے دن ہیں۔"
"کیا تمھارے پاس مسکن گولیاں ہیں۔"
"نہیں!"
صبح کے دو بج رہے تھے — مارگریٹ بستر سے نکلی، مجھے درد کی گولیاں دیں اور گرم پانی کی بوتل تیار کی۔
"ہم اس عذاب سے کیوں گزرتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔
"یہ عورت ہونے کی قیمت ہے — یہ ماں نہ بننے کا خمیازہ ہے۔" مارگریٹ نے جواب میں کہا
"میں تمھاری بات نہیں سمجھی۔"

"مجھے بھی درد ہوتا تھا — ہر مہینے درد کے دریا سے گزرنا پڑتا تھا لیکن پھر میں حاملہ ہو گئی — بچہ ہوا، اور اس کے بعد مجھے کبھی درد نہ ہوا۔"
"مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمھارے بچہ بھی ہے!"
"ہے بھی اور نہیں بھی —" بات مذاق سے شروع ہوئی تھی لیکن سنجیدہ ہو گئی —
"میں پلز پر نہیں تھی لیکن میرا خیال تھا کہ میں سیف پیریڈ SAFE PERIOD میں ہوں — میں حاملہ ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باپ بننا نہیں چاہتا تھا اور میں اکیلے بچے کی ذمہ داریاں نہیں سنبھالنا چاہتی تھی چنانچہ میں نے اس بچی کو اڈاپشن ADOPTION کے لئے دے دیا — مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ میں دوبارہ ماں نہیں بننا چاہتی چنانچہ میں نے مستقل حل تلاش کر لیا۔
"وہ کیا —"
"میں نے ٹیوبل لائگیشن TUBAL LIGATION کروالی۔"
میری طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی — میں نے چائے کی پیالی اٹھائی اور گپ شپ لگانے لگی۔
"یہ تم ہر ویک اینڈ کہاں چلی جاتی ہو۔"
وہ مسکرائی، پھر کہنے لگی۔
"اپنے دوستوں سے ملنے آرمی بیس ARMY BASE چلی جاتی ہوں — اگر میں اس چھوٹے سے کمرے میں ویک اینڈ گزاروں تو پاگل ہو جاؤں — میں ایک رومانوی قسم کی عورت ہوں — مجھے مردوں سے — جنس سے — اور — زندگی سے محبت ہے — ہمیں بار بار کہاں زندہ رہنا ہے — آرمی بیس میں ہر ویک اینڈ پارٹی ہوتی ہے — شراب و رقص کی محفل جمتی ہے۔"
وہ ایک بار پھر مسکرائی اور بولی۔
"اگلے ویک اینڈ ان کا سالانہ ڈنر ہو گا — اگر تم چاہو تو میں تمھارے لئے بھی ایک دعوت نامہ لا دوں۔"

"مارگریٹ! تم ایک مہربان دل کی مالک ہو۔"

"اور وہاں تمھیں شاید ایک سمارٹ اور وجیہہ مرد بھی مل جائے۔"

"لیکن میرا تو کنیڈا میں ایک بوائے فرینڈ ہے!"

"وہی مُسلمان آدمی۔؟"

"ہاں!"

"تب ابھی انگلینڈ میں ایک بوائے فرینڈ تھا لیکن یہاں آنے سے پہلے مَیں نے اس سے تعلقات منقطع کر دیئے —— مَیں نے کہا کہ ہم آزاد انسان ہیں اور آزادی کی ہی زندگی گزاریں گے جو تمھارا جی چاہے تم کرو اور جو میرا جی چاہے میں کروں گی —— جب ہم دوبارہ ملیں گے تو تعلقات کی نوعیت کا پھر فیصلہ کر لیں گے —— میں جانتی تھی کہ مَیں سعودی عرب ایک سال کے لئے جا رہی ہُوں۔ میں نہ تو ایک سال ہر ویکینڈ تنہا گزارنا چاہتی تھی اور نہ ہی جھُوٹے وعدے کرنا چاہتی تھی۔"

"مارگریٹ! تم ایک دلچسپ عورت ہو —— کیا تم اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ کبھی پکڑی نہیں گئیں ——؟ یہاں تو صرف محرموں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت ہے۔"

"میں یہاں سے شیرٹین ہوٹل پیدل چل کر جاتی ہُوں —— چوکیدار سے کہہ جاتی ہُوں کہ فون کرنے جا رہی ہوں۔ وہاں مجھے میرے بوائے فرینڈ مل جاتے ہیں اور میں کار میں سوار ہو جاتی ہُوں —— دو دفعہ پولیس نے پکڑا تو میں نے کہا کہ میں بوائے فرینڈ کی بیوی ہوں۔ انھوں نے شادی کے سرٹیفکیٹ کا مطالبہ نہیں کیا۔"

"تو تم آگ سے کھیلتی رہتی ہو ——!"

"زندگی میں کچھ رسک RISK تو لینے ہی پڑتے ہیں!"

آخر میں نے فیصلہ کیا کہ مارگریٹ کے ساتھ جا کر دیکھوں کہ وہ کن محفلوں میں جاتی ہے —— چنانچہ ہم شیرٹین ہوٹل گئے —— مارگریٹ کا نیا بوائے فرینڈ چارلز آیا اور ہمیں اپنی کار میں لے گیا —— میں اندر سے کانپ رہی تھی۔

وہ ایک بڑی پارٹی تھی —— کینیڈین، امریکن، فرینچ، جرمن اور بہت سے دُوسرے یوُرپین مرد اور عورتیں موجود تھے —— اس علاقے میں سعودی قوانین لاگو نہ ہوتے تھے —— میری ملاقات بہت سے لوگوں سے ہُوئی لیکن ان سب کی آنکھوں سے شہوت ٹپک رہی تھی —— مجھے کئی مَردوں نے رقص کی دعوت دی لیکن وہ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا میں اس رات فارغ تھی یا نہیں —— میں نے انکار کیا تو ان کا موڈ آف ہو گیا —— آہستہ آہستہ میں ماہیٔ بے آب کی طرح محسوس کرنے لگی۔

چند ڈانسوں کے بعد میں تو اپنی سیٹ پر واپس آ گئی —— میں حسبِ استطاعت محفوظ ہو چکی تھی —— مارگریٹ اب بھی مختلف مَردوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھی —— آخر

rekhta

پھر وہ غصے میں لوٹی۔

"چلو چلیں!"

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا۔؟"

"وہ بہت کمینہ ہے — ذلیل ہے وہ — میں اس سے نفرت کرنے لگی ہوں!"

وہ سخت غصے میں تھی۔

"کس سے نفرت ہو گئی ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"چارلز سے — وہ اب کسی اور کی زلفوں سے کھیل رہا ہے — میں نے اپنے ایک پرانے بوائے فرینڈ سے کہا ہے کہ ہمیں گھر چھوڑ آئے۔"

گھر پہنچے تو ہم سونے سے پہلے کافی دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے — میں نے پوچھا۔

"مارگریٹ! تم نے ان مردوں کو کیسا پایا۔؟"

"دلچسپ بھی اور مضحکہ خیز بھی!"

"وہ کس طرح۔؟"

"ان پانچ مردوں میں سے تین جن کی خواب گاہوں میں میں نے قدم رکھا نامرد تھے — پہلا تو کچھ کر ہی نہ سکتا تھا — دوسرے اور تیسرے نے آدھے راستے میں ہی دم توڑ دیا — ان میں سے ایک کونڈم پہنتے پہنتے لنگڑی بطخ کی طرح بیٹھ گیا اور دوسرے کو میں نے چھوا تو وہ دھوپ میں رکھی ہوئی قلفی کی طرح پگھل گیا —!"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے — آخر ایسا کیوں ہے۔؟"

"وہ سب کہتے ہیں کہ سعودی ماحول نے ان کی جنسی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے!"

"کیا تم یہ جواز مانتی ہو۔؟"

"میں تو اس مقام پر آ گئی ہوں جہاں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا مانوں اور

کیا نہ مانوں۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں مارگ۔؟"

"بتاؤ!"

"سچی بات تو یہ ہے کہ جب سے میں سعودی عرب آئی ہوں، میں خود بھی جنسی طور پر بے حس ہوتی جا رہی ہوں — میرے خواب تک بے رنگ اور بے لذت ہو گئے ہیں!"

"یہ تو سنجیدہ بات ہے!"

"ہے تو سہی لیکن بہت دیر ہو گئی ہے — چلو سو جائیں!"

"شب بخیر!"

"شب بخیر!"

بدھ کی شام کو جب میں گھر لوٹ رہی تھی تو میری ملاقات بہت سی فلپین کی نرسوں سے ہوئی وہ بھی اسی بس میں سوار تھیں ___ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ میری ہی بلڈنگ میں رہتی ہیں۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ ہماری کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی ___

وہ سب بہت خوش تھیں اور جمعرات کی رات کو پارٹی کا انتظام کر رہی تھیں، انھوں نے مجھے بھی دعوت دی۔

اگلے دن میں فارغ تھی چنانچہ پارٹی میں پہنچ گئی۔

وہ چیز اور وائن پارٹی CHESE AND WINE PARTY کی بجائے چیز اور جوس پارٹی CHESE AND JUICE PARTY تھی۔ شراب کی اس علاقے میں اجازت نہ تھی۔

میں پارٹی میں گئی تو بہت خوش خوش تھی لیکن بہت ہی ملول و غمگین لوٹی تھی۔

اگلے ہفتے بہت سی نرسیں واپس فلپین جا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی بپتا سنائی تو میرا دل بھر آیا۔ فلپین میں ایک پرائیویٹ ایجنٹ نے انھیں سعودی عرب آنے کی دعوت دی تھی اور ان سے دو ہزار ریال تنخواہ کے کنٹریکٹ پر دستخط کروائے تھے سب نرسیں بہت خوش تھیں۔ اس ایجنٹ نے سب سے پاسپورٹ لے لئے تھے۔ جب وہ نرسیں جدہ پہنچ گئیں تو ان کے کنٹریکٹ غائب ہو گئے۔ ایجنٹ نے نئے کنٹریکٹ پیش کئے، جن کے مطابق انھیں نرسنگ اسسٹنٹ اور اردلیوں کا کام کرنا تھا ___ اور ان کی تنخواہ صرف سات سو ریال تھی۔ نرسوں نے احتجاج کیا

"ہم رجسٹرڈ نرسیں ہیں۔ ہم سات سو ریال پر کام کرنے کو تیار نہیں، یہ ہماری توہین ہے، ہمیں عزت سے واپس بھیج دو۔"

کسی نے ان کی آہ و فغاں نہ سنی۔ ان کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو اپنے خرچ پر واپس چلی جائیں یا نئے کنٹریکٹ کو قبول کریں۔ ان کے پاس واپس جانے کے پیسے نہ تھے۔ 'قہرِ درویش برجانِ درویش' وہ رک گئیں۔ اب جب کہ وہ چند مہینوں کی ملازمت کے بعد اتنے پیسے جمع کر چکی تھیں کہ واپس جا سکیں تو انھوں نے ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا، وہ اس قید سے رہائی پر جشن منا رہی تھیں۔

میں نے زندگی میں کبھی اتنا غمگین جشن نہ دیکھا تھا۔

حمیرا نے مجھے بتایا کہ متحدہ عربِ امارات سے ایک مسلمان جوڑا سیر کے لئے آیا ہوا ہے اور انکی شان میں ایک دعوت کا انتظام ہو رہا ہے۔ میں بھی مدعو تھی، میری زبان پر اور میرے ذہن میں پچھلی دعوت کی یادیں تازہ تھیں، میں نے حامی بھرلی، میں باقی عرب ملکوں کے حالات بھی جاننا چاہتی تھی۔

مجھے مہمان جوڑا بہت اچھا لگا۔ میاں بیوی دونوں بہت خلیق تھے۔ خاوند وہاں کی فوج میں ملازم تھا۔ بیوی پاکستان میں بطورِ استانی کام کیا کرتی تھیں لیکن اب صرف گھریلو کاموں پر ہی اکتفا کرتی تھیں ـــــ انھوں نے جو باتیں سُنائیں وہ سعودی عرب کے حوصلہ شکن قصّوں میں سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔

خاوند نے مجھے ایک واقعہ سُنایا۔

ابوظہبی میں ایک مقامی خاندان کا بچہ بیمار ہو گیا۔ بچے کو سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی، وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو بچے کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر

نے والدین سے کہا کہ بچے کو ڈفتھیریا ہو گیا ہے اس لئے اس کا رنگ بھی نیلا ہو رہا ہے اور، وہ سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اسے فوراً ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ EMERGENCY DEPA-RTMENT لے جایا جائے۔

ایمرجنسی ڈیپارٹمنٹ میں نرس نے فوراً ڈیوٹی ڈاکٹر کو جو کہ بنگلہ دیش کا تھا بلایا۔ ڈاکٹر نے بچے کا معائنہ کیا تو بہت متفکر ہوا بچے کی زندگی اور موت کا سوال تھا ـــــ اس نے فوراً ہوا کی نالی میں سوراخ کیا اور اس میں نالی لگادی ـــــ بچے کی جان بچ گئی۔

والدین اس آپریشن کو دیکھ کر غصّے میں آ گئے اور شہزادے سے جا کر شکایت کی کہ ڈاکٹر اور نرسوں نے ان کے بیٹے کا گلا کاٹ دیا ـــــ شہزادے نے بغیر کسی تفتیش کے حکم دیا کہ ان تمام لوگوں کو برطرف کر دیا جائے جنھوں نے اس بچے کا علاج کیا ہے۔

اس حکم پر سات ملازم اپنی اپنی ملازمت کھو بیٹھے۔

ہسپتال کا میڈیکل ڈاکٹر بہت پریشان ہُوا۔ اس نے بورڈ آف ڈائریکٹر کی میٹنگ بلائی اور سب کو بتایا کہ اس کا بہترین عمل جس نے بچے کی جان بچائی اور ـــــ ٹریکیاسٹومی TRACHEOSTOMY کا آپریشن کیا برطرف کر دیا گیا ہے۔ یہ ناانصافی ہے۔ اس عملے کو انعام دینے کی بجائے سزا ملی ہے۔

ایک مقامی ڈاکٹر نے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ جا کر شہزادے سے بات کرے گا۔

جب مقامی ڈاکٹر شہزادے کے محل میں پہنچا تو شہزادہ باغ میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا ـــــ اس کے مزاج بگڑے ہوئے تھے ـــــ شاید بیوی سے لڑ جھگڑ کر آیا تھا۔

اس نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"حضور رحم کی درخواست کرنے آیا ہوں ـــ ان ملازمین کے لئے جو برطرف کر دیئے

گئے ہیں۔"

"وہ لوگ جنھوں نے بچّے کی گردن کاٹ دی تھی۔؟"

"حضور وہ ٹریکیاسٹومی کا آپریشن تھا جو بچّے کی جان بچانے کے لئے بہت ہی ضروری تھا۔"

"دفع ہو جاؤ ـــــ میں کچھ اور نہیں سُننا چاہتا ـــــ ان سب لوگوں کو نکال باہر کرو۔" اس نے مٹھی بھر چاول اس کے منھ پر دے مارے۔

وہ شرمندگی کا بوجھ اٹھائے واپس لوٹ آیا۔

تین مہینے گزر گئے ہیں وہ آج بھی بغیر نوکری کے ہیں۔

"لیکن تم ان کی فوج میں کیسے کام کرتے ہو۔؟"

"عرب مملکتوں نے خارجی افسران کو اس بات پر متعین کیا ہے کہ ان کی فوج کو ٹریننگ دیں اور قابو میں رکھیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"تاکہ ملک میں بغاوت نہ ہو سکے اور شہنشاہیت کی بنیادیں ہر لحاظ سے مضبوط ہوتی رہیں۔!"

"تمھارا مطلب ہے کہ اس طرح جمہوری انقلاب کی راہ میں کانٹے بچھائے جا رہے ہیں۔؟"

"میرا تو یہی خیال ہے۔!"

مجھے ان عرب ممالک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی چند بصیرت افروز تقریبیں دیکھنے کو ملی رہی تھیں۔

اسی تقریب میں ہماری ملاقات ایک خوب رو جوان سے ہوئی جس کا نام جمال تھا وہ انجینئر تھا اور امریکہ سے تبدیل ہو کر آیا تھا ـــــ حمیرا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ جاتی۔

جب ہم واپس آرہے تھے تو میں نے حمیرا سے پوچھا۔

"حمیرا ـــ کیا جمال نے تمھیں دوبارہ ملنے کی دعوت دی۔؟"

"ہاں۔!" اور وہ شرما گئی۔

"وہ اچھا لگتا ہے۔!"

"مجھے بھی اچھا لگا ـــــ میں نے مدت سے مردوں سے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہے۔!"

"دیر آید درست آید۔ اب میں وکینڈز پر تنہا جاؤں گی۔!"

"فکر نہ کرو میں تمھارے لئے بھی ایک تلاش کر لوں گی۔"

"تو کتنی فراخ دل ہے۔!"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جانا۔ دوستوں سے بغیر وجہ کے خفا ہو جانا حتیٰ کہ اپنے مریضوں سے جو مجھے دل و جان سے چاہتے تھے اپنے چڑچڑے پن کا اظہار کرنا میری طبیعت کے بہت ہی خلاف تھا۔

میں اپنے ماحول کے ہاتھوں بہت مجبور تھی۔

میرے تحمّل کا دامن میرے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا تھا۔

گھر سے خطوط باقاعدگی سے آتے رہے اور کبھی کبھار وہ تصویریں بھی بھیج دیتے۔

علی نے کئی دفعہ فون کیا۔ "میں تم سے محبّت کرتا ہوں، تمھاری بہت یاد آتی ہے، مجھے اب اندازہ ہوتا ہے کہ تمھیں سعودی عرب جانے کی اجازت دے کر میں نے کتنی بڑی غلطی کی ہے ....."

میں بے حسی کی چادر اوڑھے اس کی باتیں سنتی رہتی لیکن یہ نہ کہہ سکتی کہ "میں بھی تم سے محبّت کرتی ہوں" اور یہ بات مجھے متفکر رکھتی۔

مارگریٹ خوشی سے چھلانگیں لگا رہی تھی ـــــ اس کی زندگی میں ایک نیا
ں داخل ہُوا تھا۔

"وہ خوبصورت ہے ـــــ بہت ہی سیکسی SEXY ہے اور مہربان
ہے ـــــ میرا بہت ہی خیال رکھتا ہے ـــــ میں ساری عمر اسی کا انتظار کرتی
ہوں ـــــ یہ ویکینڈ ہم ساحلِ سمندر پر گزاریں گے ـــــ!" وہ جلدی جلدی باتیں کر
تی اور اپنا بیگ بھی تیار کر رہی تھی۔

"اس کا نام کیا ہے۔؟" میرے تجسس نے انگڑائی لی۔

"ڈینس ـــــ میرا محبوب۔!" اس نے کمرے سے نکلتے ہُوئے کہا ـــــ اسے
ڑ رہی تھی۔

حمیرا کے دل میں بھی گدگدی ہو رہی تھی ـــــ وہ جمال سے ملنے کے لئے جا

رہی تھی۔

"میں خوش بھی ہوں لیکن پریشان بھی ـــــ!" اس نے کہا۔

میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا ـــــ اس کے چہرے کا رنگ قدرے
زرد تھا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے!"

"کس بات کا؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں!"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"بس ـــــ ایک انجانا سا ڈر ـــــ ایک بے نام سا خوف ـــــ پتہ نہیں مجھے
کیا ہو رہا ہے۔؟"

میں خاموش ہو رہی۔

وہ بھی کچھ دیر کے لئے چپ سی ہو گئی ـــــ جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر
اچانک ہی بولی۔

"تمھارا کیا خیال ہے؟"

"کس بارے میں۔؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا یہ ملاقات کینسل کر دوں۔؟"

"پاگل ہوئی ہو ـــــ بس اتنا خیال رہے کہ تمھارے پرس میں
کونڈوم ہوں!"

"مجھے کونڈوم کی ضرورت نہیں۔ مذاق مت کرو!"

"تمھیں ضرورت نہیں لیکن ہو سکتا ہے اسے ضرورت ہو۔ ایڈز AIDS ـــــ سے
حفاظت کا بہترین ذریعہ ہیں!"

"میری جان پر بنی ہے اور تمھیں شرارت کی سوجھی ہے!"

"نہیں، میں بھی سنجیدہ ہوں!"

میری دونوں سہیلیاں چلی گئیں اور میں تنہائی میں طویل جنسی پرہیز کے فوائد پر غور کرتی رہی۔

جمعہ کی شام آ گئی لیکن وہ دونوں نہ آئیں۔ رات کے بارہ بجے تو میری پریشانی بڑھنے لگی۔ نہ کوئی پیغام، نہ کوئی ٹیلی فون —— ان دونوں نے کبھی اتنی دیر نہ کی تھی۔ اگر وہ ہفتے کی صبح کو کام پر حاضر نہ ہوئیں تو ان کی ملازمت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

میں ساری رات کروٹیں بدلتی رہی۔

ہفتے کی صبح ہو گئی، لیکن کسی کی خبر نہ تھی، کسی کو ان کا اتہ پتہ معلوم نہ تھا —— نہ کوئی پیغام، نہ کوئی ٹیلی فون۔

میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ میں کسی سے پوچھ بھی نہ سکتی تھی کیوں کہ مجھے پتہ تھا کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گئی ہیں۔ جو غیر قانونی تھا۔

اتوار کی صبح آ گئی لیکن کوئی خبر نہ ملی۔

اتوار کی شام کو مارگریٹ نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی — رنگ اُڑا ہوا۔ بال بکھرے ہوئے — کپڑے ریت اور کیچڑ میں لت پت — بہت بیمار لگ رہی تھی — مجھے دیکھا تو دوڑ کر گلے لگ گئی — اور — رو رو کر اپنی بپتا سنانے لگی۔

مارگریٹ اور اس کا بوائے فرینڈ ساحلِ سمندر کی طرف ڈرائیو کرنے لگے — کار چلاتے رہے، چلاتے رہے، چلاتے رہے — کئی گھنٹوں کے بعد انھیں اندازہ ہُوا کہ وہ صحرا میں کھو گئے ہیں — نہ کوئی ہمسفر، نہ رہبر اور نہ ہی کوئی ایسا نشان جو منزل کا اشارہ کر سکے —

دوپہر سے شام ہوئی اور پھر رات ہونے لگی — ان کی پریشانی انھیں ڈسنے لگی، نہ صرف یہ کہ رات پڑ گئی تھی بلکہ ان کی کار میں جو گیس تھی وہ بھی ختم ہونے والی

تھی۔

انھوں نے رات صحرا میں گزاری۔ اگلے دن کھانے پینے کا سامان کار میں سے نکالا اور پیدل چلنے لگے۔ گھنٹوں چلنے کے بعد بھی آبادی یا ساحلِ سمندر کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا، وہ تھک کر نڈھال ہو گئے اور خوف سے چُور —

پھر رات پڑ گئی — وہ اپنے کام پر حاضر نہ ہُوئے تھے۔

"کیا ہم اسی طرح بے نام و نشان صحرا میں مر جائیں گے اور ریت میں دفن ہو جائیں گے۔ کیا ہماری لاشیں کسی کو ملیں گی بھی یا نہیں —؟" دونوں تلخ حقائق سے ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے لگے۔

آخر ان کی دعائیں قبول ہُوئیں اور انھیں ایک بدو کا جھونپڑا نظر آیا — وہ نہ جانے اس ویران صحرا میں کیا کر رہا تھا — وہ بڑے خلوص سے پیش آیا۔ اس نے انھیں پانی، کھجوریں اور اُونٹنی کا دودھ پیش کیا اور بعد میں وہ انھیں آبادی تک پہنچا آیا۔

مارگریٹ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے چائے پیش کی اور چند گھنٹے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کی کہانی سن کر مجھے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

آدھی رات کو فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نیند میں ریسیور اٹھایا تو کیا سنتی ہوں کہ حمیرا کی آواز تھی۔

"تم کہاں ہو۔؟" میں چند لمحوں میں ہی جاگ گئی تھی۔

"جیل میں، آؤ اور مجھے لے جاؤ۔" وہ رو رہی تھی۔

پولیس نے اسے حراست میں لے رکھا تھا۔ میں رات کے اس پہر تو کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اگلی صبح کام پر جانے کی بجائے میں حمیرا کے پاس گئی۔

حمیرا کی حالت مارگریٹ سے بھی بدتر تھی۔ پولیس نے اسے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ پھرتے ہُوئے پکڑ لیا تھا۔ اس پر نامحرم کے ساتھ تعلقات رکھنے کا الزام تھا۔ اسے جیل میں رکھا گیا تھا جہاں اسے کھانے کے لئے بھی کچھ نہ ملا تھا۔

میں اپنے ایڈمنسٹریٹر کے پاس بھاگی بھاگی گئی تاکہ کچھ مدد حاصل کر سکوں۔ اس پتھر کے انسان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

"یہ میرا مسئلہ نہیں ہے!" اس نے روکھے انداز میں کہا۔

"لیکن وہ تمھاری ماتحت ہے، تمھارا فرض ہے کہ اس کی مدد کرو۔" میں غصے میں چیخ رہی تھی۔

"نہیں! میری کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ مسئلہ پولیس کا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ۔" وہ بھی غصہ ہو گیا۔

میں پولیس اسٹیشن بھاگی بھاگی گئی اور بہت روئی چلائی لیکن کسی نے بھی میری فریاد نہ سنی۔

"یہ اس ملک کا قانون ہے!" سب کا یہی جواب تھا۔

پولیس نے حمیرا کو ملک سے بہتر گھنٹے میں نکل جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے اس کے پاسپورٹ پر ملک بدر ہونے کی مہر لگائی جس پر وجہ ثبت تھی۔ "طوائف"۔

میں نے اسی دن ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

سعودی عرب چھوڑنے کا سب سے مشکل مرحلہ مریضوں، اور رفقائے کار سے جدائی تھی ــــ جب انھیں میرے جانے کی خبر ملی تو انھوں نے ایک پارٹی کا انتظام کیا۔

ان سب کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ میں نے جب ان سے ہاتھ ملایا اور انھیں گلے لگایا تو میری آواز رندھ گئی۔ ان دیہاتیوں سے مجھے اُنس ہو گیا تھا وہ بہت پیارے انسان تھے۔ میں جذبات سے اتنی مغلوب تھی کہ صحیح طریقے سے انھیں خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی۔

"کیا میں انھیں پھر کبھی نہ ملوں گی ــــ" یہ ایک اُداس خیال تھا۔

میں نے ہوائی جہاز میں سونے کی لاکھ کوشش کی، لیکن بے سود ___ ٹورانٹو کی فلائٹ کافی لمبی تھی ___ میں ڈیڑھ مہینے کے بعد گھر لوٹ رہی تھی۔

ہوائی اڈے پر سارا خاندان میرا منتظر تھا ___ انھیں میرا تار مل گیا تھا ___

"کتنی حیرانی کی بات ہے کہ تم یہاں ہو"۔ سب نے مل کر کہا۔

آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے ___ میری آواز رندھ گئی تھی۔ ان سب عزیزوں سے دوبارہ ملنا ایک دکھ بھری خوشی تھی۔

جب ہم کار میں اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے تو میری بہن نے سرگوشی کی۔

"علی ایرپورٹ نہ آسکا، وہ چند دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہے"۔

"اس سے کہہ دینا کہ میں چند ہفتے اس سے نہیں ملنا چاہتی ___!"

جب ہم کار میں اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے تو میری بہن نے سرگوشی کی۔

علی ایرپورٹ نہ آسکا، وہ چند دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہے۔"

اُس سے کہہ دینا کہ میں چند ہفتے اس سے نہیں ملنا چاہتی —!"

میری طبیعت بحال ہونے میں کئی ماہ لگ گئے — اپنے احساسات کو سپردِ قلم کرنا اتنا آسان نہ تھا۔

"کیا تم کسی اور عورت کو سودی عرب جانے کا مشورہ دو گی — ؟ ایک دن میرے دل نے مجھ سے پُوچھا۔

اور میں بہت دیر تک سوچتی رہی۔

اپریل ۱۹۸۷ء